www.urducouncil.nic.in
قیمت: -/10 ₹

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جولائی 2020

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

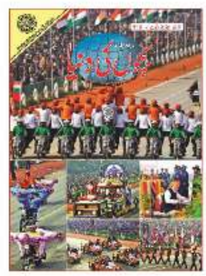

سب سے زیاہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون:24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	مقدس دیوانگی کی مثال: میرابائی	حقانی القاسمی	5
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		11
جہان نسواں	پرتیبھا رائے کے منتخب اڑیا افسانے:		
	ایک مطالعہ	قمر جمالی	12
	بانو سرتاج کی کہانیاں	محمد دانش غنی	18
	تانیثیت: معنی، مفہوم اور ضرورت	محمد عامل بدایونی	22
	مہرالنساء پرویز کی کہانیوں میں نسائی مسائل کی عکاسی	محمد نہال افروز	27
	اردو کی خواتین افسانہ نگار	عروسہ فاروق	34
	غربت کی نسواں کاری: ہندوستانی تناظر میں	کے۔اطہر صائمہ	40
کہانیاں	پناہ	فرحت نادر رضوی	44
	بھوک	ناہید طاہر	47
حسن سخن	ڈاکٹر شبنم عشائی، ڈاکٹر شاذیہ کمال، ندا کاظمی		51
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		54
صحت	سن یاس یا انقطاع الطمث	حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی	56
آرائش وزیبائش	حسن کی نگہداشت		59
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		61

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 4 شمارہ: 7 جولائی 2020

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

سرورق: گلشن آرا

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

اس وقت پوری دنیا ذہنی انتشار میں مبتلا ہے۔ چاروں طرف ایک ہنگامہ برپا ہے۔ کورونا وائرس نے پورے سماجی اور معاشی نظام کو بہت متاثر کیا ہے۔
اس کے بڑھتے دائرے کو دیکھتے ہوئے بہت سے خدشات لاحق ہیں جب کہ ہمیں یہ بھی امید ہے کہ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکل آئے گا۔ قدرت کے کارخانے میں ہر چیز متحرک رہتی ہے۔ نامساعد حالات کے باعث جو اشیا منجمد ہو جاتی ہیں کچھ وقت کے بعد اس میں بھی تبدیلی آتی ہے اور وہ اپنی ابتدائی شکل سے بہتر شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ کورونا کے بعد بھی بہت سی نئی تبدیلیاں ہر سطح پر آئیں گی لیکن یہ تبدیلیاں کس نوعیت کی ہوں گی اور معاشرے پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے اس بارے میں ابھی کچھ کہنا مشکل ہے۔

دنیا کے بیشتر ممالک وقتاً فوقتاً ایسی وباؤں کے شکار ہوتے رہے ہیں۔ وباؤں کے بعد ایک نیا نظام ایک نیا انقلاب اور ثقافت کو نئے تناظر اور نئے سیاق میں سمجھنے کا موقع بھی ملا ہے۔

کورونا کے بحران سے ایک نیا ادب سامنے آئے گا جو ادب کو نئے سرے سے سمجھنے میں ہماری مدد کرے گا۔ اس سے ایک نیا طرز فکر بھی پیدا ہوگا جو نوجوان نسل کو بہت متاثر کرے گا۔ یہ وبا ہمارے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ ہر کوئی اس صورت حال سے باہر نکلنے کے لیے پرعزم ہے اور اپنے اپنے طور پر اس سے بچاؤ کی عملی تدابیر بھی جاری ہیں۔

فطرت اپنے ساتھ کوئی کھلواڑ برداشت نہیں کرسکتی۔ لہٰذا ہمیں ایسے طریقۂ زندگی کو اہمیت دینی ہوگی جو کسی بھی لحاظ سے فطرت کے اصولوں کے خلاف نہ ہو۔ فطرت کے بنائے گئے اصولوں سے انحراف کیا تو اس کے منفی اثرات ہماری زندگی پر پڑ سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں ماحولیاتی تحفظ پر سنجیدگی سے توجہ دینی ہوگی۔ ہمیں ایسے عمل سے گریز کرنا ہوگا جو ماحول اور معاشرے میں بحران کو جنم دیتے ہیں۔

کورونا سے ملک کی معیشت پر سب سے زیادہ اثر پڑا ہے۔ کمزور طبقے کے پاس وسائل اور روزگار کی بہت کمی ہو جائے گی جس سے انسانوں کی نفسیات پر منفی اثر پڑ سکتا ہے۔ ہمیں اپنی معیشت کو بہتر بنانے کے لیے ایسے ذرائع کا استعمال کرنا ہوگا جو روزگار کے بہتر سے بہتر مواقع فراہم کرسکے کیونکہ اس کا اثر سب سے زیادہ ہمارے اس طبقے پر پڑا ہے جن کے پاس وسائل اور روزگار کی کمی ہے۔

یہ تو واضح ہے کہ کورونا کے اثر سے وسیع پیمانے پر تبدیلیاں آئیں گی۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ کورونا انسانی معاشرے میں نئے طرز عمل کو فروغ دینے میں کامیاب ہو۔ یہ تبدیلیاں ادیب اور قاری دونوں کی سوچ پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ پچھلی صدی کی اہم وبا اسپینی فلو تھی جس کے اثرات سیاسی اور سماجی سطح پر دیکھے گئے تھے۔ اس وقت ارنسٹ ہیمنگوے کے ناول 'بوڑھا اور سمندر' کو اہم ناول قرار دیا گیا تھا۔ ان کا یہ ناول انسانی جدوجہد کو ظاہر کرتا ہے۔ کورونا کے بعد ادب میں بھی نئے طرز اور نئے رجحانات پیدا ہوں گے جو پہلے کے ادب سے مختلف ہو سکتے ہیں۔

کورونا نے ہمیں زندگی کے ہر عمل میں تبدیلی لانے پر مجبور کیا ہے۔ جس طرح کے مسائل ہمارے سامنے آئے ہیں وہ ہمیں سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنی طرز زندگی میں بھی تبدیلی لانی ہوگی کیونکہ جب تک ہمارے طرز حیات میں تبدیلی نہیں آئے گی تب تک ہم اسی طرح کے مسائل سے دو چار ہوتے رہیں گے۔ اس بحران سے جو مسائل پیدا ہوئے ہیں ان کے حل کی طرف بھی ہمیں توجہ دینی ہوگی۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

حقانی القاسمی

مقدس دیوانگی کی مثال

میرا بائی

پریم بھکتی کے سمندر میں غرق میرا بائی بغاوت اور آزادی کا استعارہ تھی۔ نسائی احساس کی ایک حسین علامت، عطوفت اور ایثار کا ایک رمز جس کے وجود کی ساری عبارتیں کرشن جی سے منسوب تھیں۔

میرا بائی نے کرشن کا پریم رس پی لیا تھا اس لیے ان کی شاعری میں صرف اور صرف ایک ہی آہنگ ہے اور وہ ہے کرشن کا آہنگ۔ ان کی کائنات میں صرف ایک ذات تھی اور آرزو کا ایک ہی مرکز — جس کے کئی روپ تھے کرشن، کنہیا، کیشو، گردھر، گوپال، مرلی، مراری، ماکھن چور، من موہن، مادھو، گوبند، گوپی نندن، گوپی ناتھ، گوبردھن، نند لال، شام، گھن شیام، ہری، کشن، جناردھن، دارشٹئی، بنواری — میرا بائی کو کرشن کے تمام روپ سے اتھاہ پریم تھا۔

میرا بائی نے عشق کے عروج کو پالیا تھا، ان کے عشق میں تموج تھا، اضطراب تھا۔ میرا کے عشق نے اس نقطہ کو چھولیا تھا جہاں انسانی ذہن 'شونیہ' میں داخل ہو جاتا ہے۔ ماورائے ذہن کیفیات سے الگ ایک ایسے جزیرے میں جہاں احساس کی اضطرابی لہریں اظہار میں ڈھل کر تحیر کی سی کیفیت پیدا کرتی ہیں اور طلسم کائنات کا عقدہ واشگاف ہو جاتا ہے۔

میرا کی محبت میں کرشن کے جذبے کی آنچ تھی اسی لیے وہ آنچ کبھی مدھم نہیں ہوئی۔ درد ہجر کے ساتھ شعلگی بڑھتی ہی گئی۔ برہ کی آگ میں وصل کی آرزو کندن کی طرح چمکتی رہی۔ اس ہجر میں سندر مدھر ملاپ تھا اور وصال میں ہجر کی آگ روشن تھی:

سیاں تم بن نیند نہ آوے
پلک پلک موہے یگ سے بیتیں
چھن چھن ورہ جراوے سو

(سیاں تمھارے بغیر مجھے نیند نہیں آتی ہے۔ ایک ایک پل میرے

لیے قیامت ہے اور ہر لمحہ ہجر کی آگ میں جلتی ہوں۔ــــ متن اور ترجمہ: پریم وانی، مرتبہ علی سردار جعفری)

○

رسیا بن نیند نہ آوے
نیند نہ آوے وِرہ ستائے پریم کی آنچ ڈھلاوے
بن پیا جوت مندر اندھیارا دیپک دائے نہ آوے
پیا بن میری سیج الونی

(رسیا کے بغیر نیند نہیں آتی، نیند نہ آئے برہ ستائے، پریم کی آنچ پگھلائے، یہاں روشنی کے بغیر مندر میں اندھیرا ہے، دیپک کام نہیں دیتا۔ پیا بغیر میری سیج سونی ہے۔ــــ متن اور ترجمہ: پریم وانی)

○

چوڑیاں پھوروں مانگ بکھیروں
کجرا میں ڈالاروں دھوئے ری
نس باسر موہی برہ ستاوے
کل نہ پرت پل موئے ری

(میں اپنی چوڑیاں توڑ ڈالوں گی اور مانگ مٹا ڈالوں گی اور آنکھوں سے کاجل دھوڈالوں گی۔ ہر پل مجھے ہجر کا درد ستارہا ہے اور ایک لمحہ کو قرار نہیں۔ــــ متن اور ترجمہ: پریم وانی)

○

تم بن رہیو نہ جائے
جل بن کنول چند بن رجنی
ایسے تم دیکھیاں بن سجنی
آکل بنا کل دھروں رین
ورہ کلیجو کھائے
دوس نہ بھوکھ نیند نہیں رینا

(تمھارے بغیر جینا دوبھر ہے جیسے بغیر پانی کے مچھلی، بغیر چاند کے رات اداس ہوتی ہے ویسے ہی تمھارے دیدار کے بغیر سجنی کی حالت ہے۔ رات دن بے کل اور پریشان رہتی ہوں اور جدائی کلیجے کو کھائے جارہی ہے دن کو بھوک نہیں رات کو نیند نہیں۔ــــ متن اور ترجمہ: پریم وانی)

میرا بائی نے کرشن کی ذات میں اپنے وجود کو مدغم کردیا تھا۔ وہ تحیر کا پیکر تھیں جن کے وجود میں تحیرات کے بحرِ بے کراں رواں دواں تھے۔ میرا کے خارجی وجود کو اس باطنی وجود کی تلاش تھی جو کرشن سے عبارت ہے۔ میرا بائی کو اپنی شناخت کھوجانے کا نہیں بلکہ ایک نئی شناخت کے حصول کا جنون تھا۔ کسی اور کے وجود میں اپنی شناخت کی جستجو اور اپنے وجود کو 'ذات دیگر' میں جذب کردینا بہت بڑا ایثار ہے اور میرا بائی اس ایثار کی ایک مجسم تعبیر تھیں:

آپ بنا موہے کچھ نہ سہاوے پرکھاں سب سنسار
(میں نے تمام دنیا دیکھ لی، تمھارے بغیر مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ــــ متن اور ترجمہ: پریم وانی)

میرا پربھو گردھر لال بن پل چھن رہیو نہ جائے
(میرا اپنے گردھر لال کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔ــــ متن اور ترجمہ: پریم وانی)

ان بن سب جگ کھارو لاگت اور بات سب کانچی
(ان کے بغیر ساری دنیا بے مزہ ہے اور ہر بات کچی لگتی ہے۔ــــ متن اور ترجمہ: پریم وانی)

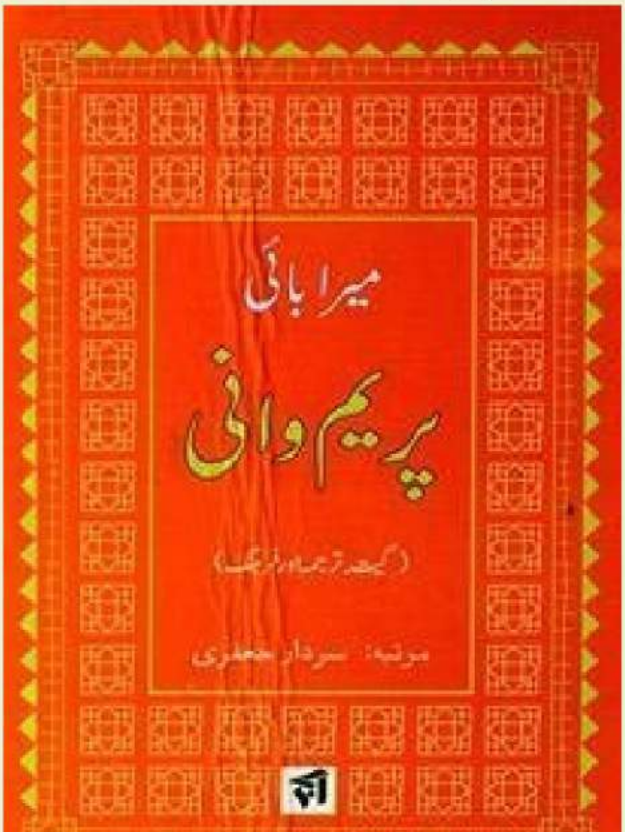

○

میرا کہے پربھو برج کے باسی
تم میرے ٹھاکر میں تری داسی
(میرا کہتی ہے کہ برج کے رہنے والے میرے پربھو تم میرے

مالک ہو، میں تمھاری داسی ہو۔۔۔۔ متن اور ترجمہ: پریم وانی)

○

میرا داسی جنم جنم کی
انگ سے انگ ملا دو ہو
(میرا تو جنم جنم کی داسی ہے۔اس کے جسم سے اپنا جسم ملا دو۔۔۔۔ متن اور ترجمہ: پریم وانی)

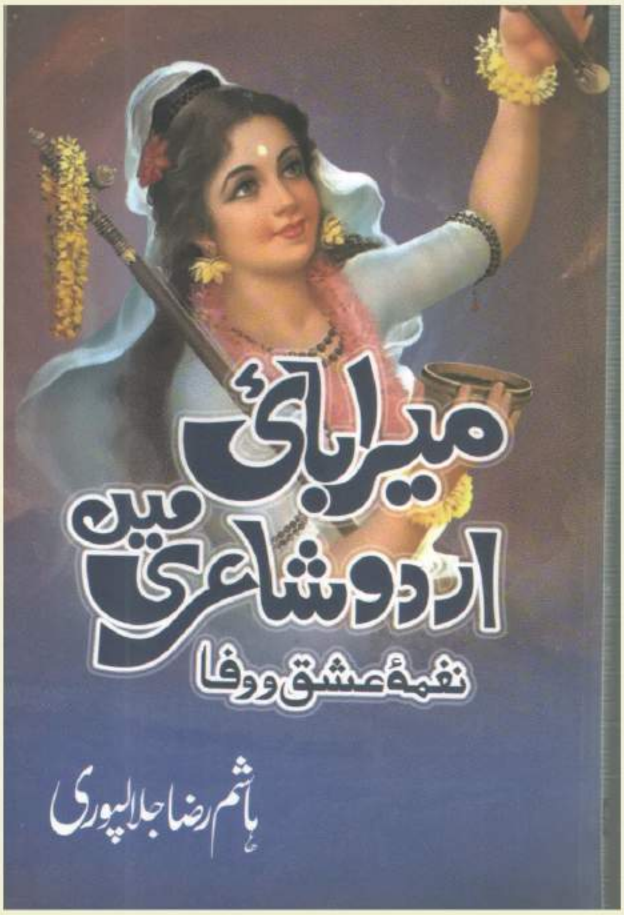

میرابائی اپنے وجود میں کرشن کے ارتعاشات (Vibrations) کو محسوس کرتی رہیں اور انہی ارتعاشات کو اظہار کی شکل عطا کی۔ میرابائی کے نغموں میں کرشن کنہیا کی بانسری کی مقناطیسی آواز ملتی ہے، اسی اظہار کی مقناطیسیت ہے کہ میرابائی کے نغموں نے ابدیت حاصل کر لی کیونکہ میرا کی تخلیق میں شیرینی، سادگی اور شدت ہے جو جمالیاتی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

میرابائی کی شخصیت میں اتنی انرجی اور توانائی تھی کہ میرا نے ہر اس زنجیر کو توڑا جس سے نسائی تشخص اور توقیر کی تحقیر ہوتی ہو۔ فرسودہ اور رجعت پسندانہ اقدار وافکار سے انکار کی بھرپور جرأت ان کے اندر تھی۔ میرا بائی کے شوہر کی وفات کے بعد جب انھیں 'ستی' کے لیے کہا گیا تو میرابائی نے منع کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ میرے شوہر تو کرشن جی ہیں۔ وہی پتی پرمیشور ہیں:

میرا کے پربھو گردھر ناگر، جھک مارو سنساری
(میرے پربھو تو گردھر ہیں باقی دنیا جھک مارتی ہے)

میرابائی نے ایک فنتاسی کو حقیقت میں بدل دیا اور پوری زندگی اسی تخیل اور تصور کے آہنگ کے ساتھ گزار دی اور بالآخر اپنے زمینی وجود کو کرشن جی کے وجود میں تحلیل کر دیا۔ اس طرح آتما کا پرماتما سے وصال مکمل ہوا۔ آتماؤں کا یہ آلنگن اتنا اننت اور آنندمے تھا کہ آج تک دونوں آتمائیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔

میرابائی کا دل صرف کرشن کے لیے دھڑکتا تھا۔ ان کی پوری شاعری میں صرف اور صرف کرشن ہیں۔ عقیدت سے بھری ہوئی شاعری جس میں منفیت کو مثبت میں تبدیل کرنے کا عمل روشن تھا۔

میرابائی کی شاعری میں ایک سوسولہ چاندراتوں کا کیف آگیں خمار بھی ہے اور سرمستی و نشاط بھی۔ محبت کی آشفتہ سری کو میرا سے زیادہ خوبصورت زبان نہیں ملی اور نہ ہی اس سے حسین اظہار۔ محبت اپنی تمام تر کلیت کے ساتھ اور عشق اپنی تمام تر وحشت خیزی کے ساتھ میرا کی شاعری میں موجود ہے۔ میرا کی شاعری میں محبت بھی ہے، مزاحمت بھی، سا ہس بھی ہے، سمرپن بھی۔ عشق کی ماورائیت اور معرفت بھی ہے۔ ان کی تخلیق کی داخلی سطح میں ایک متحرک اور توانا لہر ہے اور اس لہر کا نام ہے گردھر گوپال۔ ان کی پوری شاعری میں اسی فنتاسی کا عمل روشن ہے:

بسو میرے نینن میں نندلال

میرابائی ہمیشہ گردھر کے گیت گاتی رہیں اور کرشن کے سانولے رنگت کے لیے تڑپتی رہیں۔ بس ان کا مقدس لمس تھا جس کو پانے کی آرزو تھی، انھیں ہر چیز میں صرف کرشن جی کا جلوہ محسوس ہوتا تھا۔ درخت ہو، پہاڑ ہو، پھول ہو، آندھی ہو، نباتات ہو، جمادات ہو ہر ایک میں کرشن کا چہرہ ہی نظر آتا تھا۔ کرشن کے بغیر کائنات کا تصور ہی ممکن نہ تھا۔ کرشن جی کی مورتی کے سامنے بیٹھی ریاضت کرتیں، عبادت میں مصروف رہتیں، گیت گاتیں ہر وقت بس ایک ہی خیال کرشن جی کا اور یہی خیال یا تصور میرابائی کے لاشعور پر اس قدر حاوی تھا کہ زندگی کے آخری لمحہ تک نکل نہ پایا۔

پہلی نگاہ اور پہلے نقش کا معاملہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ یہ معاملہ اس وقت کا ہے جب میرابائی چار سال کی تھیں۔ میرابائی کے گھر کے سامنے سے شادی کا جلوس گزر رہا تھا۔ میرا نے ایک خوبصورت لباس میں ملبوس دولہا کو دیکھا اور بڑی معصومیت سے اپنی ماں سے سوال کیا۔' پیاری ماں

میرا دولہا کون ہوگا؟' میرا کی ماں مسکرائی اور کرشن جی کی مورتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا 'میری ننھی منی تمھارا دولہا یہی ہوگا۔' میرا کی ماں کا انتقال ہوگیا تبھی سے میرا بائی کی کرشن جی کے لیے چاہت بڑھنے لگی اور میرا کو یقین ہوگیا کہ کرشن ہی ان کے شوہر ہیں۔ بچپن میں کرشن جی کی ایک مورتی کسی سادھو نے دی تھی۔ میرا بائی اسی مورتی کے ساتھ کھیلتی کودتی اور اسی کے ساتھ سوتی تھیں۔ اس طرح ایک امیج حقیقت میں بدلتی رہی اور کرشن جی ایک حقیقی وجود کی طرح میرا بائی کے حواس پر چھاتے گئے۔

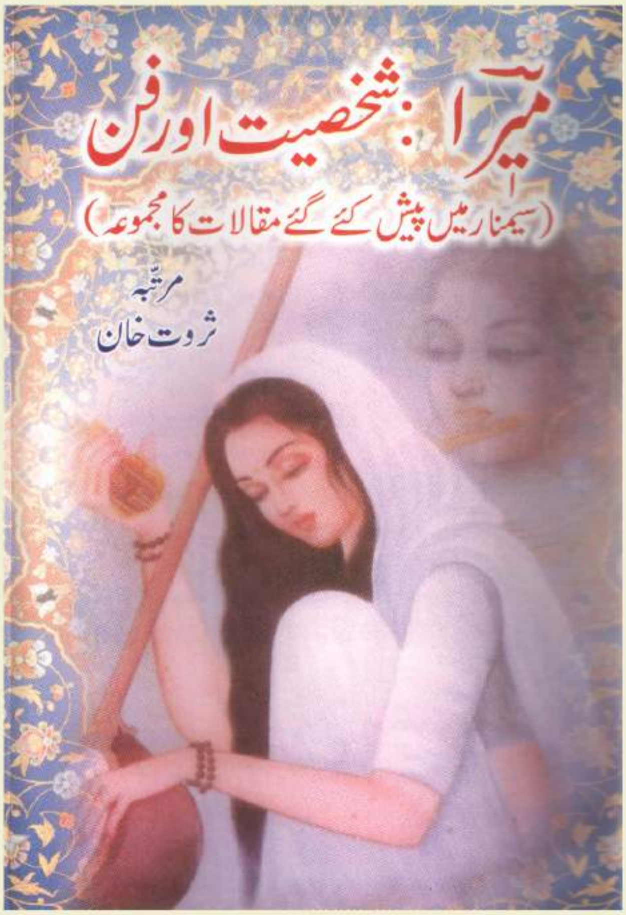

میرا بائی بہت حسین تھیں۔ دور دور تک ان کے حسن کا شہرہ تھا۔ میواڑ کے مہاراجہ سنگرام سنگھ نے اپنے بیٹے بھوج راج کی شادی کی بات میرا کے دادا میڑتا ریاست کے بانی راؤ دودا کے سامنے رکھی تو دادا راضی ہو گئے مگر میرا کی مرضی اس میں شامل نہیں تھی۔ اسی وقت کرشن جی خواب میں آئے انھوں نے کہا کہ 'گوپیکائیں اپنے شوہروں اور اپنے خاندان کی ذمہ داریاں ادا کرسکتی ہیں اور میرے ساتھ بھی رہ سکتی ہیں۔' میرا کی شادی چودہ سال مکمل ہونے سے قبل ہی رانا سے ہوگئی مگر میرا ہمیشہ کرشن کی عبادت میں مصروف رہتیں اور ان کی مورتی کے سامنے رقص کرتی رہتیں۔ اسے دیکھ کر محل کی خواتین میں میرا کے خلاف سرگوشیاں شروع ہوگئیں، یہ بات گشت کرنے لگی کہ میرا کا کسی اور کے ساتھ خفیہ رشتہ ہے۔ میرا کی دیورانی نے ایک بار اپنے بھائی سے کہا کہ میرا مندر میں اپنے عاشق سے بات کرتی ہے۔ اتفاق سے رانا کو اس مندر میں لے جایا گیا تب اس نے مندر کا دروازہ کھولا تو دیکھا کہ میرا وجدانی حالت میں مورتی سے باتیں کر رہی ہے اور گیت گا رہی ہے۔ رانا چیخا کہ میرا مجھے اپنا وہ محبوب دکھاؤ جس سے تم باتیں کر رہی تھیں۔ میرا نے کہا یہ مورتی میرا محبوب ہے۔ اس طرح کرشن جی کی محبت شدت اختیار کرتی گئی۔ میرا بائی نے مارواڑ، میواڑ اور اپنا گھر بار چھوڑا اور برنداون کی راہ لی مگر اس سے پہلے اپنے گرو تلسی داس سے پوچھا تو انھوں نے یہی کہا کہ تم اپنا گھر بار چھوڑ کر چلی جاؤ چاہے کتنے بھی قریبی رشتے دار ہوں، جیسے پر ہلاد نے اپنے باپ کو چھوڑ دیا تھا، وبھیشن نے اپنے بھائی راون کو چھوڑ دیا اور بھرت نے اپنی سوتیلی ماں کو چھوڑ دیا تھا اور برج کی عورتوں نے کرشن کے لیے اپنے شوہروں کو چھوڑ دیا تھا۔

میرا بائی کی راہ میں بہت سی صعوبتیں آئیں مگر حوصلہ مند میرا نے کسی کی پرواہ نہیں کی۔ ان کے ذہن میں صرف ایک ہی جنون سوار تھا کرشن سے وصال کا۔ چنانچہ وہ برنداون پہنچیں۔ برنداون میں ان کی روح کی دنیا بدل گئی۔ برنداون میں انھوں نے جیو گوسوامی سے درشن کی درخواست کی تو انھوں نے کہا کہ وہ کسی عورت سے ملنا پسند نہیں کرتے۔ میرا نے کہا کہ میں تو سمجھتی تھی کہ برنداون میں صرف گردھر گوپال ہی پرش ہیں۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ برنداون میں کرشن کے علاوہ بھی کوئی پرش ہے۔ جیو گوسوامی کو شرمندگی محسوس ہوئی اور انھیں احساس ہوا کہ میرا کرشن کی پرم بھکت ہیں اور بھکتی سادھنا کی بلندی تک پہنچی ہوئی ہیں۔

میرا برنداون کے مندروں میں گیت گاتی رہیں، رقص کرتی رہیں — جب ان کی شہرت رانا تک پہنچی تو رانا بھی برنداون آئے اور میرا سے اصرار کیا مگر میرا نے کہا رانا جی یہ جسم تمھارا ہے مگر میرا ذہن، جذبہ اور روح کرشن کا ہے اور پھر اچانک غائب ہوگئیں اور چلانے لگیں گردھر بلا رہے ہیں میں آرہی ہوں۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک روشنی سی ہوئی اور جب دروازہ دوبارہ کھلا تو میرا کی ساڑی کرشن کی مورتی سے لپٹی ہوئی تھی۔

میرا بائی ایک شہزادی تھیں مگر اپنی ساری مسرتوں کو تیاگ دیا اور ویراگیہ کی زندگی اختیار کرلی۔ محل کو چھوڑ کر مندر میں پناہ لی۔ جوگنی کی طرح پیلے کپڑے پہننے لگیں — ہر وقت گردھر گوپال کے گیت گاتی رہتی صرف ایک نام تھا گردھر گوپال جو ہمیشہ ورد زبان رہتا۔

مورے تو گردھر گوپال دوسرو نہ کوئی
ماتا چھوڑی، پتا چھوڑے چھوڑے سگا سوئی

سانده‌ا سنگ بیٹھ بیٹھ لوک لاج کھوئی
سنت دیکھ دوڑی آئی، جگت دیکھ لائی
پریم آنسو ڈار ڈار امر بیل ہوئی

(گردھر گوپال کے سوا اور کون ہے جسے میں اپنا کہوں، ان کے لیے ماں باپ عزیز، اقارب سب کو چھوڑ آئی اور سادھوؤں کے ساتھ بیٹھ بیٹھ کر اپنی دنیاوی شرم وحیا بھی ترک کر دی۔ جب کوئی سنت دکھائی دیا تو دوڑ کر اس کے ساتھ ہو لی اور جب دنیا سامنے آئی تو رونے لگی۔ میں نے محبت کے آنسوؤں سے عشق کی امر بیل کو سینچا ہے۔—— متن اور ترجمہ: پریم وانی)

O

میں گردھر کے گھر جاؤں
گردھر مہارو سانچو پریتم
دیکھت روپ لبھاؤں
رین پڑے بن ہی اٹھ جاؤں
بھور بیٹھے آٹھ آؤں
رین دِنا واکے سنگ کھیلوں
جیوں توں نہ ہی مرجھاؤں
بھور بھئے اٹھ آؤں
جو پہراوے سوہی پہیروں
جو دے سوئی کھاؤں
میری ان کی پریت پرانی
ان بن پل نہ رہاؤں
جنہاں بٹھاوے تت ہی بیٹھوں
بیچے تو بک جاؤں
میرا کے پربھو گردھر ناگر
بار بار بلی جاؤں

(میں گردھر کے گھر جاتی ہوں۔ گردھر میرا سچا پریتم ہے جس کا حسن دیکھ کر میرا دل خوش ہو جاتا ہے۔ رات ہوتے ہی میں اٹھ کر چلی جاتی ہوں اور بھور ہوتے ہی اٹھ کر چلی آتی ہوں۔ رات دن اس کے ساتھ کھیلتی ہوں اور ہر ممکن طریقے سے اسے رجھاتی ہوں۔ جو وہ پہناتا ہے وہی پہنتی ہوں، جو دیتا ہے وہی کھاتی ہوں۔ میری ان کی محبت پرانی ہے۔ ان کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی۔ وہ جہاں بٹھائے گا وہیں بیٹھ جاؤں گی اور اگر بیچے گا تو بک جاؤں گی۔ میرا پربھو گردھر ناگر ان پر بار بار قربان جاؤں۔ —— متن اور ترجمہ: پریم وانی)

میرا بائی نے بہت سے نغمے لکھے مقدس نغمے جو ہمارا روحانی ورثہ ہیں جس میں دو متضاد لہروں کا امتزاج ہے، جدائی کا درد اور مقدس ملن کی مسرت۔ ان کی پوری شاعری شرنگار رس کی شاعری ہے۔

سولہویں صدی عیسوی میں راجستھان کے میواڑ کے گاؤں کرکھی میں پیدا ہونے والی میرا کے نصیب میں رانی بننا لکھا تھا مگر اس نے رانی بننے کے بجائے ریاضت کو ترجیح دی اور آج وہ ایک بھگتی کی شاعرہ کی حیثیت سے عالمی سطح پر جانی جاتی ہیں۔ جنھوں نے پچھلے پہر کی آہٹوں کو اظہار کا وہ حسن عطا کیا ہے جس حسن کا نہ کوئی ثانی ہے اور نہ کوئی نظیر۔ ایک لازوال روحانی نغمہ جو برندان کی فضاؤں سے نکل کر پوری دنیا میں پھیل رہا ہے اور اس نغمے میں اس قدر نشاط ہے کہ دنیا بھر کی عورتیں ان نغموں کے ذریعے مکتی کا راستہ تلاش کرتی ہیں کہ ان نغموں میں کرشن کی بانسری کی آواز ہے اور کرشن کی بانسری جب بجتی ہے تو ہر طرف دیوانگی چھا جاتی ہے۔ شاید دنیا اسی رقص دیوانگی سے روشن ہے اور یہی دیوانگی اور حقیقی عشق تو وجود کی کلیت کا استعارہ ہے، عشق بیل جب کسی وجود سے لپٹتی ہے تو فنا کر دیتی ہے۔ عشق تو فنائی جذبے کا نام ہے۔ عشق وہ ہے جو میرا بائی نے گردھر ناگر سے کیا ہے۔ جس کے تصور میں کھوئی کھوئی سی ہر شئے میں انہی کا جلوہ انہی کا نور دیکھتی رہی۔ رنگین چولی اتار کر کھردری لوئی اوڑھ لی۔ موتیوں اور مونگوں کے ہار اتار کر جنگلی پھولوں کی مالا پہن لی۔ پاؤں میں محبت کے گھنگھرو اور بدن پہ یادوں کا لباس زیب کر کے کرشن کی یاد میں ہمیشہ مگن رہی۔ میرا بائی کو راج نہیں ریاضت سے، تاج نہیں تپسیا سے لگاؤ تھا۔ اس لیے عرفان محبت نے انھیں اس حقیقت کا ادراک کرایا کہ:

کرنا پھکیری پھر کیا دلگیری
سدا مگن میں رہنا جی
کوئی دن گاڑی کوئی دن بنگلہ
کوئی دن جنگل بسنا جی
کوئی دن ہستی نے کوئی دن گھوڑا
کوئی دن پاؤں چلنا جی
کوئی دن کھاجائے کوئی دن لاڈو
کوئی دن فاکم فاکا جی

(جب فقیری ہی کرنا ہے تو پھر رنج کیا، ہمیشہ مگن رہنا چاہیے۔ کسی دن گاڑی پر سفر میں، کسی دن جھونپڑے میں، کسی دن جنگل میں، کسی دن ہاتھی پر چلنا، کسی دن گھوڑے پر اور کسی دن پیدل۔ کسی دن کھاجا لڈو کھانا اور کسی دن فاقہ کر لینا۔—— متن اور ترجمہ: پریم وانی)

جنم جنم کی داسی میرابائی نے کرشن کے عشق کی شراب پی لی تھی اور ہری کے رنگ میں رنگ کر بس یہی کہتی رہی:

تارا گن گن رین وبھانی سکھ کی گھڑی کب آوے

(میں تارے گن گن کر رات گزارتی ہوں، آخر سکھ کی گھڑی کب آئے گی)

گھر آنگن نہ سہاوے پیا بن موہی نہ بھاوے

پیا پردیس رھاوے

سونی سیج جہر جیوں لاگے

سسک سسک جیا جاوے

نیند نندرا نہیں آوے

(گھر آنگن اچھا نہیں لگتا، پیا کے بغیر من نہیں لگتا۔ پیا پردیس میں ہے۔ سونی سیج زہر جیسی لگتی ہے۔ سسک سسک کر جان جا رہی ہے۔ نیند بھی نہیں آتی ہے۔)

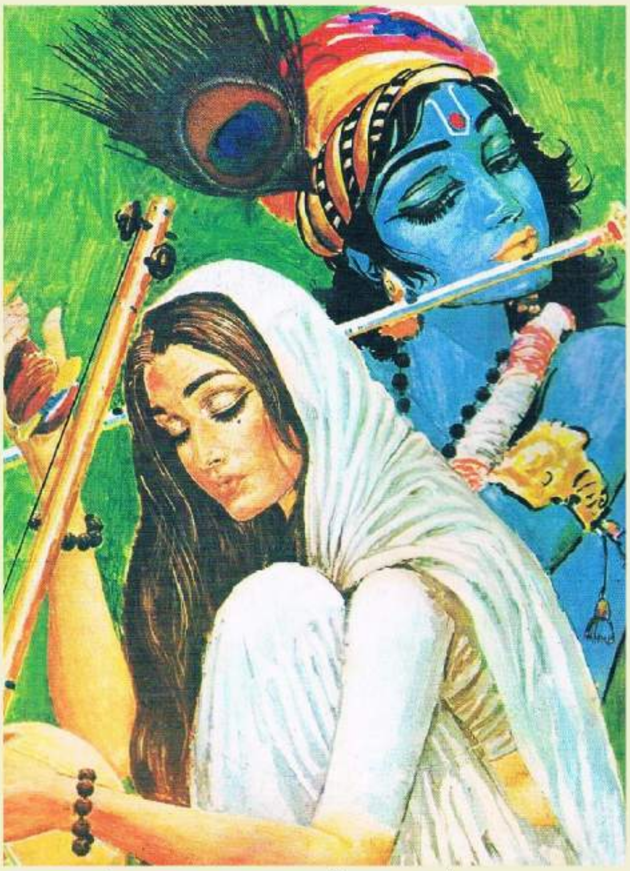

میرا کے اسی نغمہ، ہجر و جدائی نے پوری دنیا سے وصال کی راہ ہموار کی۔ کائنات کے ہر حساس ذہن سے میرا کے نغمہ کا رشتہ جڑ گیا۔ اسی لیے اہل نظر کہتے ہیں کہ دنیا نے دو ایسی شاعرات دیے ہیں جن سے محبت کرنے والے ہر زبان، ہر قوم اور ہر کونے میں موجود ہیں۔ ایک یونان کی سیفو، دوسری ہندوستان کی میرابائی جس کے بارے میں صفدر آہ کا خیال ہے کہ 'میرابائی سے بڑی شاعرہ ہندوستان کی سرزمین پیدا نہیں کر سکی'۔

میرا کے عشق کی زبان سے اردو بھی ناآشنا نہیں ہے۔ اہل اردو نے بھی میرا سے اپنی وارفتگی اور شیفتگی کا ثبوت دیا ہے اور ان کی تخلیقی جمالیات اور جمالیاتی تخیل کو اپنے شعور کا حصہ بھی بنایا ہے۔ ممتاز ترقی پسند ادیب و شاعر علی سردار جعفری نے جہاں 'پریم وانی' (مطبوعہ آج کی کتابیں، کراچی، 2009) کے ذریعہ میرابائی کے نغمہ ایثار و وفا کو اردو روپ دے کر میرابائی کو ہمارے ذہنوں میں زندہ و تابندہ کیا اور کلام میرا کی تفہیم کی راہیں آسان کی ہیں وہیں ڈاکٹر ثروت خاں نے میرابائی کی دیوانگی اور جذبہ عشق کو خراج محبت پیش کرنے کے لیے 'میرا: فن اور شخصیت' کے عنوان سے ایک کتاب ترتیب دی جس میں میرابائی کی حیات اور شاعری پر بہت وقیع مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر نند چترویدی کے خطبات کے علاوہ پروفیسر محمد عقیل رضوی، پروفیسر کلیان سنگھ شیخاوت، شاہد ماہلی، علی احمد فاطمی، نگار عظیم، منجو چترویدی، کلثوم بانو، ثروت خاں، نرملا شاہ، شوبھا دیوپرا، رتو متھارو، چندرکانتا بنسل، تسنیم خانم، غلام آسی رشیدی، ڈاکٹر فرغانہ، محمد افضل، صفدر آہ، لطیف اللہ، سید ثاقب حسن رضوی، شمس کنول، خلیل تنویر، صادقہ نواب سحر اور افتخار امام صدیقی کی بیش قیمت تحریریں شامل ہیں۔ شاید میرابائی پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے۔

ان کے علاوہ ہاشم رضا جلالپوری نے بھی میرا کے بھجنوں اور پدوں کو اردو کا منظوم روپ دیا ہے۔ یہ کتاب میرابائی اردو شاعری میں (نغمہ عشق و وفا) کے عنوان سے 2019 میں شائع ہوئی ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے فیض یافتہ ہاشم رضا جلالپوری نے میرا بائی کے جذبات و احساسات کو بہت خوبصورت شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔

اردو کے معروف ادیب، شاعر اور صحافی فاروق ارگلی نے میرابائی کی حیات پر بہت ہی عمدہ ڈاکیومنٹری بنائی ہے۔ جس میں میرابائی کے تمام آثار کے احاطے کے ساتھ ان کے بھجنوں کی خصوصی موسیقی ترتیب دی گئی ہے۔ اردو میں میرابائی پر اپنی نوعیت کی پہلی دستاویزی فلم ہے۔ یہ فلم امریکن شہری جناب ظفریاب ابراہیم کی کمپنی Crispus International(INC) کی جانب سے تیار کی گئی ہے اور فی الحال Amazon Prime پر امریکہ اور یورپ میں دکھائی جا رہی ہے۔

□□□

Cell:9891726444

haqqanialqasmi@gmail.com

شاعرات کے منتخب اشعار

مری بقا کے لیے لائیے چراغ کوئی
میں روشنی تو ہوں لیکن ابھی شرر میں ہوں

نہ پوچھ مجھ سے ابھی منزلِ سحر کا پتا
چراغ راہ ہوں لیکن ابھی سفر میں ہوں

عزیز بانو داراب وفا

یہ روشنی کا تسلسل بجا سہی لیکن!
یہ حادثے بھی ہمیں فکر مند کرتے ہیں

خدا ہی جانتا ہے کس کی کیا ہے محرومی
رئیس وقت بھی کشکول لے کے پھرتا ہے

مظفر النساء ناز

وہ مرا وہم نظر تھا کہ ترا عکس جمیل
وہ کون تھا کہ جو منظر کے درمیاں گزرا

اگرچہ طرز عمل اس کا ناگوار بھی تھا
مگر وہ میرے تصور کا شاہکار بھی تھا

سیدہ شان معراج

زندگی بھوکی بھکارن کی طرح
در بہ در پھرتی ہے سارے شہر میں

حادثوں کی گرد میں لپٹے رہے
موت کے کتنے نظارے شہر میں

سیما نظمی

پڑتی ہیں اگر دل پر محبت کی نگاہیں
بڑھ جاتی ہے کچھ اور سنورنے کی تمنا

جہان بھر کی محبت ہمیں ملے نہ ملے
غضب تو یہ ہے ترا آستاں نہیں ملتا

مسعودہ حیات

ساتھ میرے اپنے سائے کے سوا کوئی نہ تھا
اجنبی تھے سب جہاں میں آشنا کوئی نہ تھا

سارے رشتے ریت کی دیوار تھے موسم کے پھول
بات کا سچا یہاں دل کا کھرا کوئی نہ تھا

نور جہاں ثروت

زخموں کی وادیوں میں بلا کا سکوت تھا
ہم دل کی دھڑکنوں کی صدا ڈھونڈتے رہے

ادھر کھلی آنکھوں پہ رکھ کے دیر تک اس کی کتاب
جانے کیا سوچا کیے ہم آنسوؤں کے درمیاں

صدیقہ شبنم

یاد آ گیا جو دل تو ہوئی آنکھ خوں چکاں
اجڑے ہوئے کہیں در و دیوار دیکھ کر

وہ نام جس نے مسخر کیے تھے کون و مکاں
دلوں کے واسطے اب بھی وہ اسم اعظم ہے

اسما سعیدی

قمر جمالی

پرتیبھا رائے کے منتخب اڑیا افسانے: ایک مطالعہ

اڑیا ادب کی صف اول کی ادیبہ کے افسانوں کا ترجمہ 'پرتیبھا رائے کے منتخب افسانے' جسے محترم عبدالمتین جامی صاحب نے اردو میں ترجمہ کیا ہے زیر مطالعہ ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر سید مشیر عالم صاحب سکریٹری اڈیشا اردو اکاڈمی نے تحریر کیا ہے۔

ابتدا میں ڈاکٹر سید مشیر عالم صاحب نے اڑیا زبان کی ابتدا او رارتقا پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ انھوں نے اڑیا زبان کو پراکرت او رپالی زبانوں کے ملاپ سے پیدا ہونے والی زبان بتایا ہے۔ اپنی بات کو مدلل کرنے کے لیے محترم نے لکھا ہے:

''سارلا داس راجا کپیلیندر (1435-67) کا ہم عصر تھا۔ اس کے بعد 'راماین'، 'مہابھارت' اور 'چنڈی پوران' جیسی مذہبی تصنیفات منظر عام پر آئیں۔' (مذکورہ کتاب، ص9)

چونکہ اڑیا ادب میں سارلا داس کو پہلا شاعر مانا جاتا ہے جس کی اولین تصنیف ' آدی پروا' (Adi Purva) جو بھگوان جگناتھ جی کی توصیف پر مشتمل ہے وہ راماین ، مہابھارت اور چنڈی پوران جیسی تصنیفات سے پرانی ہے، سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اڑیا زبان و ادب اردو ادب سے بہت پہلے مروج تھی اور اس کے ابتدائی نشان پندرہویں صدی میں موجود ہیں۔ آگے فاضل مضمون نگار لکھتے ہیں:

'اڑیاں زبان نے ارتقائی سفر طے کرتے ہوئے اکیسویں صدی میں اتنی ترقی کی کہ کل ہند سطح پر اڑیا قلم کاروں کی حیثیت کو تسلیم کیا جانے لگا۔ گیان پیٹھ ایوارڈ اور ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ جیسے گراں قدر اعزازات سے نوازے جانے لگے۔'

اول الذکر اقتباس سے یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ اڑیا ادب اردو ادب سے بہت پرانا ادب ہے۔ چونکہ میں نے اڑیا ادب کا باضابطہ مطالعہ نہیں کیا اس لیے یہ کہنے کے موقف میں نہیں ہوں کہ اڑیا افسانے کی ابتدا اور ارتقا کی تاریخ کیا ہے لیکن یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ دوسری زبانوں کی طرح اڑیا ادب کی ابتدا بھی شاعری سے ہوئی ہے۔ اس حقیقت سے

کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ 'ادب' خواہ کسی زبان کا ہو قوموں کی شناخت کا وسیلہ ہے اور اپنے 'عصر' یعنی زمانے میں پنپتا ہے گو کہ......

'عصر' کا کوئی مادی وجود نہیں پھر بھی حیات انسانی کے تبدل وتغیر کے تمام اسرار و معنی کا مخزن ہے۔ خود اللہ تعالیٰ 'سورۂ عصر' میں وقت کی قسم کھاتا ہے کہ 'وقت' حیات انسانی کا ضامن ہے جو مسلسل متحرک ہے اور توڑ پھوڑ کے عمل سے گزرتا ہے۔

''عصر' کا کوئی مادی وجود نہیں پھر بھی حیات انسانی کے تبدل و تغیر کے تمام اسرار و معنی کا مخزن ہے۔ خود اللہ تعالیٰ 'سورۂ عصر' میں وقت کی قسم کھاتا ہے کہ 'وقت' حیات انسانی کا ضامن ہے جو مسلسل متحرک ہے اور توڑ پھوڑ کے عمل سے گزرتا ہے۔'

درحقیقت......

اسی شکست وریخت سے تہذیبیں جنم لیتی ہیں اور قوموں کی تشکیل ہوتی ہے۔ تہذیبوں کے ان بدلتے اقدار کے ردوقبول کا تحفظ ہی درحقیقت ادب کی ترقی ہے۔

ہٹلر نے کہا تھا:

'اگر کسی قوم کو تباہ کرنا ہو تو سب سے پہلے اس قوم کے کتب خانوں کو جلادو'۔

کیونکہ ادب کسی بھی قوم کی تہذیبی وراثت کا امین ہے۔

کولمیا کا گارسیا مارکر نے کہا تھا:

'ادب ایک طویل المیعاد ہتھیار ہے'۔

اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کا تخلیق کرنے والا اپنے گردوپیش، اپنی قومی شناخت، قومی مقصد، عوامی رجحان، اخلاقی اور فکری میلان اور نقطۂ نظر سے باخبر ہو۔

زیر مطالعہ کتاب ایک ایسی نابغۂ روزگار شخصیت کے تخلیقی اظہار کا نتیجہ ہے جنھیں اڑیا ادب میں صف اول کی ادیبہ شمار کیا جاتا ہے۔ محترمہ نے سیکڑوں افسانے، ناول، ڈرامے لکھنے کے علاوہ سماجی جہت کار کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت بنائی ہے۔ مصنفہ کی تخلیقات ہندی، مراٹھی، آسامی، گجراتی اور بنگلہ زبانوں کے علاوہ چند غیر ملکی زبانوں میں بھی منتقل ہو چکی ہیں۔ ان گراں قدر ادبی خدمات کے لیے انھیں 'مورتی ایوارڈ' اور 'گیان پیٹھ ایوارڈ' سے بھی نوازا جاچکا ہے۔ اڑیا عوام انھیں نفرت اور نسلی منافرت کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں امید کی شمع مانتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ میں محترمہ کی تصنیفات کو پہلی مرتبہ اردو کے قالب میں پڑھ رہی ہوں مگر میری خوش نصیبی کہ میں ان سے دو بار مل چکی ہوں۔ پہلی مرتبہ 1995 میں جب ساہتیہ اکاڈمی، دہلی کی جانب سے مجھے ٹراویل گرانٹ ملی تھی تب میں نے اڈیشا کا دورہ کیا تھا جہاں آبادی کے صرف دو فی صد لوگ اردو زبان سے واقف تھے۔ میں اسی وقت ان کی پرکشش شخصیت سے کافی متاثر ہوئی تھی۔ مزید برآں کہ اس وقت میں جن ادیبوں سے ملی شانتنو کمار آچاریہ، ڈاکٹر مہانتی، پرافل ترپاٹھی اور کچھ نام اس وقت ذہن میں آنہیں رہے ہیں۔ ان سے مل کر اور ان کی تخلیقات دیکھ کر میں نے خود کو ایک ریزہ جتنا محسوس کیا تھا۔ ان ادیبوں کی الماریاں ان کی اپنی تصنیفات سے بھری پڑی تھیں۔ اس وقت کی روداد کو میں نے بڑی تفصیل سے قلم بند کیا ہے مگر وہ انگریزی میں ہے۔ دوسری بار خود اپنے شہر حیدرآباد کے ایک پروگرام میں ملاقات کا شرف حاصل رہا۔ دونوں موقعوں پر میں نے انھیں انتہائی سادہ اور منکسر المزاج پایا۔

خیر یہ بات تو برسبیل تذکرہ قرطاس پر آگئی۔ میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ پرتیبھا رائے ایک نہایت متحرک شخصیت کا نام ہے۔ انھوں نے ادب کو برائے ادب نہیں بلکہ ان میں موجود حوادث کو جی کر لکھا ہے۔

یہ محض میری جرأتِ اندازہ، یا پھر محترم عبدالمتین جامی صاحب کی محبتوں اور اخلاص کا نتیجہ ہے کہ اپنے احساسات مرتسم کر رہی ہوں۔

اس کتاب میں کل 25 افسانے ہیں۔

انھیں پڑھتے ہوئے میں بڑے خوشگوار احساسات سے گزر رہی ہوں۔ میں نے درج بالا متن میں عرض کیا ہے کہ ادب قوموں کی شناخت کا وسیلہ ہے۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر میں اڑیا قوم کی تہذیب سے متعارف ہوئی ہوں جو کم وبیش تمام ہندوستانی تہذیبوں سے مماثلت رکھتی ہے بالخصوص ہندو تہذیب جس میں دیوی دیوتاؤں کی عظمت کا اعتراف، خاندانی وقار کی پاسبانی، خاندانی ڈھانچہ جس میں ماں باپ، بھائی بہن، بیوی خاوند، ساس بہو، باپ اور بیٹی کی عزت اور رشتوں کا تقدس شامل ہے۔

اس انتخاب میں شامل افسانے بیانیہ ہیں۔ محترمہ پرتیبھا رائے صاحبہ کا انداز بیان سادگی میں پرکاری لیے ہوئے ہے۔ تصنع، بناوٹ اور پیچیدگی سے دور یہ افسانے قاری سے اس کی مکمل قرأت کا تقاضہ کرتے ہیں اگرچہ یہ افسانے قدرے طویل ہیں اور جزئیات نگاری اتنی مفصل ہے کہ

کہیں لگتا ہے کہ تشبیہات اور استعاروں کی مدد سے بیانیہ کی طوالت کو ایجاز و اختصار میں بدلا جا سکتا تھا۔

سادہ بیانیہ میں تحریر کیے گئے یہ افسانے اپنے عصری تہذیب، سماجی ڈھانچہ، معاشرتی نظام اور اخلاقی معیار کے آئینہ دار ہیں۔ ان افسانوں میں خاندان، اس کی تشکیل، استحکام اور افراد خاندان کا اس کی تشکیل میں حصہ اور ذمہ داریوں پر زور دیا گیا ہے۔ مصنفہ کے ہاں ہر ہندوستانی ادیبوں کی طرح ماں، کا درجہ نہایت اعلیٰ وعرفہ ہے۔ وہ ماں کو خاندان کا اہم ستون اور اچھے اقدار پر تشکیل پائے خاندان کو ناقابل تسخیر قلعہ مانتی ہیں۔

آم کا پیڑ، دستی باکس، معتوب، پریم پتر اسی قبیل کی کہانیاں ہیں جن میں کردار اپنی تمام تر اچھائیاں برائیاں نیکیوں سفاکیوں، عیبوں اور عیبوں سے پاک اخلاقی قدروں کے ساتھ اپنے کنبوں میں جیتے ہیں۔ دراصل ان افسانوں میں ہر افسانہ انفرادی تجزیے کی مانگ کرتا ہے، ہندوستانی معاشرہ خواہ مذہب کچھ ہو ذات کچھ اپنے اندر مشترک اقدار کا امین ہے۔ مثلاً 'آم کا پیڑ'۔

> 'ادب قوموں کی شناخت کا وسیلہ ہے۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر میں اڑیا قوم کی تہذیب سے متعارف ہوئی ہوں جو کم و بیش تمام ہندوستانی تہذیبوں سے مماثلت رکھتی ہے بالخصوص ہندو تہذیب جس میں دیوی دیوتاؤں کی عظمت کا اعتراف، خاندانی وقار کی پاسبانی، خاندانی ڈھانچہ جس میں ماں باپ، بھائی بہن، بیوی خلوند، ساس بہو، باپ اور بیٹی کی عزت اور رشتوں کا تقدس شامل ہے۔'

اس افسانے میں آم کا پیڑ محض پھل دینے والا درخت ہی نہیں ہے بلکہ خاندانی قدروں کا استعارہ ہے۔ ماں کو ان کے پتی پرمیشور کا تحفہ ہے جسے وہ ہر قدم پر سنبھال کر رکھتی ہے۔ اس کے پھل کو رشتہ داروں اور محلے میں بانٹ کر فخر محسوس کرتی ہے۔ یہ پیڑ ماں کو اپنی اولاد کی طرح عزیز ہے۔ اس کے لیے ہر دکھ سہنے کے لیے تیار ہے حتیٰ کہ طوفان و باد و باراں کی زد میں آ کر جب یہ پیڑ زمیں بوس ہو جاتا ہے تو اسی وقت ماں بھی اپنی جان چھوڑ دیتی ہے اور پیوند خاک ہو جاتی ہے۔

'دستی باکس' کہانی میں استعارہ بن کر ابھرتا ہے۔ دستی باکس یعنی قلمدان ایک عورت (ماں) کے نجی جذبات کا امین ہے۔ وہ تاحیات اس قلم دان کو یوں سنبھال کر رکھتی ہے کہ اس کی اولاد اس مغالطے میں مبتلا ہو جاتی ہے کہ ضرور کسی پوشیدہ خزانے کا راز یا خاندانی جائیداد کے دستاویز ہوں گے۔ مگر جب ماں دنیا سے گزر جاتی ہے تو اولاد کو اس پلندے میں خود ان کے باپ کا ماں کے نام جوانی میں لکھا خط ملتا ہے۔ ماں تاحیات اس خط کی عبادت کرتی ہے حالانکہ اسے اپنے شوہر سے کبھی کچھ ملتا نہیں ہے بلکہ وہ تو صرف وصولی ہی کرتا رہا ہے۔

محترمہ پرتیبھا رائے کے نزدیک عورت کا ایسا صاف ستھرا تصور ہے جس میں عورت چراغ خانہ ہے جو خود جل کر روشنی پھیلاتی ہے اور جس کی زندگی کا سفر چوکھٹ سے چتا پر ختم ہو جاتا ہے۔

'معتوب' اور 'پریم پتر' اسی قبیل کی کہانیاں ہیں جو درونِ خانہ بنی ہوئی ہیں۔ ہاں مگر 'اینٹک' اسی زمرے کی کہانی ہونے کے باوجود مختلف ہے۔ یہ کہانی دراصل دور حاضر کا نوحہ ہے جہاں یہ قول ثابت ہوتا ہے کہ:

پڑھی لکھی اولاد سب سے پہلے اپنے ماں باپ کو تنہا چھوڑ دیتی ہے،

یہ کہانی آج کے دور کا المیہ ہے اور گھر گھر کی کہانی ہے۔ درد میں ڈوبی اس کہانی کا Pathos یعنی حزن قاری کو رونے پر مجبور کرتا ہے۔ ماں باپ جب ضعیف ہو جاتے ہیں تو ان کے جمائے ہوئے ساز و سامان کی حیثیت اینٹک جیسی ہو جاتی ہے اور اولاد انھیں اپنے دیوان خانوں میں سجانے کے لیے لے جاتی ہے۔ مگر جو واقعتاً اینٹک ہیں ضعیف ماں باپ۔

انھیں کون سنبھالیں؟

اس کہانی کا کلائمکس ملاحظہ کیجیے:

بوڑھی نے بوڑھے سے پوچھا 'پرانی چیزوں کی اگر اتنی مانگ ہے تو ہم کو کیوں نہیں لے جاتے۔'

'لیں گے ضرور لیں گے۔ اینٹک کی طرح ایک دیکھنے کی چیز میں تبدیل کر کے رکھنے والا ہی پرانی چیزوں کی قدر کرتا ہے۔ وہ ضرور اپنے پاس لے جائے گا۔ ذرا صبر سے انتظار کرو۔' بوڑھے نے بوڑھی کو دلاسہ دیا۔

'وہ پھر کون ہے'

'وہی جو نئے کو پرانا کرتا ہے۔ لیکن پرانے کو اینٹک نہیں کرتا بلکہ اسی پرانی چیز کو نیا روپ دیتا ہے۔'

'ٹھیک ہے تو پھر اس کا جب جی چاہے ہم کو لے لے۔ ہمارا کیا چارہ ہے؟'

بوڑھی نے رعشہ زدہ ہاتھوں کو اپنے سر سے لگا لیا۔ یہاں مصنفہ

نے تناسخ یعنی آواگون کی طرف اشارہ کیا ہے۔ 'اکھنڈ دیپ' میں ماں اپنے بچوں کے لیے ہر طرح کی قربانی دیتی ہے۔ انھیں کسی بھی فکر سے دور رکھنے کے لیے اپنی تکلیف کا کسی سے ذکر نہیں کرتی۔ حد یہ کہ اس کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہتی ہے پھر بھی وہ اپنے پوتوں اور پوتیوں کی بے غرض خدمت کرتی رہتی ہے۔ بچوں کو ٹھیس اس وقت لگتی ہے جب ڈاکٹر کہتا ہے:

'بڑے دکھ کی بات ہے کہ تمھاری ماں کی بینائی چھن گئی۔ صحیح وقت پر ڈاکٹر کو دکھانے سے یہ حالت دیکھنے کی نوبت نہ آتی۔ بڑی تعجب کی بات ہے کہ مریضہ کو یہ بات معلوم تھی لیکن آپ کو کیسے نہیں معلوم۔'

تب بیٹوں کو ہوش آتا ہے اور بڑا بیٹا تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:

'تو نے اتنی بڑی سزا کیوں دی۔ ہم لوگوں کے چہروں کو دیکھنے کی خواہش کیوں چھوڑ دی؟'

تب ماں کہتی ہے 'ماں کو اپنے بچوں کو دیکھنے کے لیے ظاہری آنکھوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ماں کی آنکھیں دل کے اندر ہوتی ہے۔' یہی جوت اصل میں اکھنڈ دیپ ہے۔ اس کہانی کو پڑھتے ہوئے قاری کے دل میں کئی سوالات سر اٹھاتے ہیں۔ سب سے پہلے یہی کہ آدمی اگر جنم سے اندھا ہو تو وہ اپنے حالات سے سمجھوتا کر لیتا ہے۔ مگر جب آنکھ والے کی آنکھ چلی جاتی ہے تو وہ اپنا اعتماد اور حوصلہ کھو بیٹھتا ہے۔ چہ جائیکہ یہاں وہ گھر کی ذمہ داریاں حسب معلوم نبھاتی رہتی ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ بوڑھا بوڑھی کسی تنہا مقام پر تنہائی کی زندگی گزار رہے ہیں اور انھیں پوچھنے والا کوئی نہیں۔ یہاں بھرا پورا گھر ہے۔ بیٹے ہیں، بہو ہیں۔ پوتے پوتیاں ہیں۔ پھر بھی کسی نے محسوس نہیں کیا کہ بڑھیا کی آنکھوں کا نور جاتا رہا۔ کچھ اٹ پٹا سا لگتا ہے۔ پرتیبھا رائے کی ماں ایسی ہی ہے:

خاک ہو جائیں گے ہم تجھ کو خبر ہونے تک

والی۔ یہی مصنفہ کا تصور ہے کہ ماں محض عورت نہیں 'دیوی' ہے۔

پرتیبھا رائے ایک زیرک اور دروں بین ادیبہ ہیں۔ انھوں نے اپنے کرداروں کی ایک psychologist یعنی ماہر نفسیات کی طرح تجسیم کی ہے۔ کردار سازی میں محترمہ کا قلم جواہر پاش ہے۔ 'شریف آدمی'، 'دوستی کا جنم'، 'خون' اور 'مسیحا' ان افسانوں میں انھوں نے ایسے کردار تراشے ہیں جو اڑیا ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

'شریف آدمی' ایک اسکول ماسٹر کی کہانی ہے۔ نارائن ماسٹر سو بھدرا کے استاد ہیں۔ سو بھدرا ایک بارسوخ آدمی کی بیوی ہے۔ اس کا سابقہ ہمیشہ حاجت مندوں اور ضرورت مندوں سے پڑتا ہے۔ اسے جب نارائن ماسٹر کا اس کے دروازے پر آکر لوٹ جانے کا علم ہوتا ہے تو پریشان ہو جاتی ہے کہ اگر وہ نارائن ماسٹر کی خواہش کی تکمیل نہ کر سکے تو خود کو معاف نہیں کر سکے گی۔ مگر کہانی کے کلائمکس پر پتہ چلتا ہے کہ نارائن ماسٹر اس کے گھر کچھ مانگنے نہیں بلکہ وہ دو ہزار روپے جو انھوں نے سو بھدرا کے والد سے بطور قرض لیے تھے، جس کے سود سمیت دس ہزار روپے بنتے تھے، اپنی زندگی کی واحد ملکیت زمین کا ٹکڑا بیچ کر واپس لوٹانے آئے تھے تاکہ مقروض نہ مریں۔ آخر اس سربستہ راز سے پردہ ان کی موت کے بعد ہی اٹھتا ہے۔ یہ کہانی بہت خوبصورت ہے۔ اس میں سو بھدرا کی ذہنی کشمکش کا نقشہ ایک ماہر نفسیات کی طرح نہایت چابک دستی سے کھنچا گیا ہے۔ ایک طرف تو وہ اپنے استاد کی بہت عزت کرتی ہے اور نہیں چاہتی کہ ان کی عزت میں کمی ہو۔ پوری کہانی سو بھدرا کے کرب کی داستان ہے جو قاری کو گلوگیر کر دیتی ہے۔

'دوستی کا جنم' ایک ایسے پروہت کی کہانی ہے جو روایتی پروہتوں سے بالکل مختلف۔ رتھ بابو مذہب کے نام پر عوام کو گمراہ نہیں کرتے اور نہ انھیں تکلیف دیتے ہیں۔ دوسرے پانڈوں کے برعکس یہ پوجا پاٹھ بڑے سہل انداز میں کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے 'سواہا' کا مطلب خود کو وقف کرنا۔ جو دوسروں کے کام آئے وہی پروہت ہے۔ اس طرح کے پھولوں کی جگہ صرف پانچ سے ہی کام چلاتے ہیں اور کہتے ہیں نذر و نیاز بھکتی اور وشواش میں ہے۔

نفسیاتی کہانیوں میں 'مسیحا' سب سے اچھی کہانی ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ایک الیشن کتا ہے جس کا نام لائن ہے۔ اس کہانی میں لائن کو انھوں نے بطور تمثیل پیش کیا ہے۔ ہر ذی روح کو آزادی پسند ہے۔ لائن بھی فطری طور پر اسی کا متمنی ہے۔ اگرچہ لائن اپنے مالک اور مالکن کے لاڈ پیار سے شاہی زندگی گزارتا ہے مگر اس کی مرضی اور چاہ اس کے مالکوں کے پاس قید ہے۔ وہ گیٹ کے باہر پھرنے والے آوارہ کتوں پر رشک کرتا ہے۔

تمام عمر مالک کا وفادار رہا ہے ان کے گھر اور گھر کے افراد کی حفاظت کرتا رہا۔ کتوں کی طبعی عمر پندرہ سال ہوتی ہے۔ یہی لائن جب چودہ سال کا ہو جاتا ہے، چلنے پھرنے سے معذور ہو جاتا ہے اور پیشاب پاخانہ اصولوں کے مطابق مقررہ جگہوں پر نہیں کر سکتا زخم میں کیڑے پڑ جاتے ہیں اور جسم سے بدبو پھوٹنے لگتی ہے تو مالک اس کی Mercy Killing کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ بس ایک اشارے کی ضرورت ہے۔ مگر کسی بھی جاندار کو مارنا ہر مذہب میں گناہ ہے۔ یہاں بھی مالک اور مالکن اور اس کا نگہبان سب ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہیں کہ کون اس کی

غیر فطری موت کا اشارہ کرے گا اور نرک میں جائے گا۔ احساس گناہ مانع ہے۔ یہاں مصنفہ نے ایک راوی کی طرح کتے کی نفسیات کا جس خوبصورت انداز میں اظہار کیا ہے یہ انھیں کا حق ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

'بستر مرگ پر لیٹتے ہوئے وہ انسانوں کے احساسِ گناہ، سوکھے چہرے اور ضمیر کے درمیان ہونے والی جنگ کو دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اپنے سکھ کے لیے میری زندگی کو تم لوگوں نے مقصد بنا رکھا ہے۔ اب میری موت کو بھی مقدر کر رکھا ہے۔ مجھے زندگی تو بخش نہیں سکتے موت دینے میں بھی کنجوسی کر رہے ہو۔ اپنے جینے کا حق نہیں تو مرضی سے مرنے کا بھی حق نہیں ہے۔ ابھی ذرا سی موت دینے کے گناہ سے خوف زدہ ہو۔'

اس کہانی کا عنوان مسیحا بڑا معنی خیز ہے۔ بظاہر پہلی قرأت میں اس عنوان کو Justify کرنا مشکل ہے۔ مگر غور سے نجات دلانے والا کوئی نہیں ہے کیونکہ وہ فطری موت مرتا ہے۔ بلکہ اس کہانی میں مسیحا خود لائن ہے۔ وہ جب اپنے مالکوں کو احساس گناہ اور نرک کے حصہ دار بننے کے احتمال سے لڑتے دیکھتا ہے تو خاموشی سے آنکھیں موند کر ابدی نیند سو جاتا ہے۔ یہی الیشن ڈاگ ان کے لیے مسیحا بن جاتا ہے۔ یہ بہت اچھی کہانی ہے۔

پرتیبھا رائے ایک نڈر، بے خوف اور بیباک قلم کار ہیں۔ مذہب کے معاملے میں وہ Hindu Orthodox سے بالکل مختلف ہیں۔ ملاحظہ کیجیے: ایک اگھوری لیڈر مخاطب ہے۔

'ارے اس کل یگ میں ان کانوں نے کیا سنا کہ کسی اور کے ٹھاکر نے ہمارے ٹھاکر کے گھر بار کو دخل کر لیا۔ ہم اگھوری ہونے کی وجہ سے افسوس کیوں کریں؟ ٹھاکر بھی اگھوری ہو گئے۔ ان کے سر پر چھپر نہیں ہے۔ بیچارے اس وقت سردی میں کتنی تکلیف اٹھا رہے ہوں گے۔ ان کے گھر کو کسی نے دخل کر لیا۔' (کتاب مذکور، ص 153)

'رام ٹھاکر کب گھر والے تھے کہ آج بے گھر ہو گئے۔ پیدائش ہی سے منی رشی کے ساتھ جنگل جنگل گھومتے رہے۔ چور، ڈاکو اور بدمعاش شیطانوں کے پیچھے دوڑتے رہے۔ جو ملا کھایا پیا۔ وہ تو سب سے بڑے سبا کھیا (سب کچھ کھانے والے) ہیں جہاں جگہ ملی سو گئے ہماری طرح وہ بھی اگھوری ہو گئے ہیں۔'

'بھاشن کیوں دیتے ہو؟ کس نے دیکھا ہے رام 'اس شہر' اور خاص اسی جگہ پیدا ہوئے تھے۔ کوشلیا کے یہاں بچہ پیدا ہوتے وقت کون سی نرس، ڈاکٹرنی تھی۔ اگر ہوتی تو بتا سکتی تھی کہ ٹھیک کس جگہ رام نے جنم لیا۔ تریتا یگ موجود کون سا انسان زندہ ہے جو اس بات کی گواہی دے گا۔''

(مذکورہ کتاب، ص 161)

ایک اور مقام پر لکھتی ہیں:

'بس ہو گیا۔ اگر چہ رام ایک انسان ہیں تو وہ پیدا ہوئے بھی تھے اور مر بھی گئے۔ بہت نیکیاں کی ہیں اس لیے ایشور کے اندر سما گئے۔ یعنی ان کو ایشور پراپت ہو گیا۔'

(مذکورہ کتاب، ص 161)

مصنفہ کے نزدیک خدا کا تصور بہت پاک اور صاف ستھرا ہے۔ وہ خدا کو نرآکار مانتی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

'روشنی کی طرح ایشور ایک طاقت ہے۔ وہ خود نظر نہیں آتا لیکن ساری دنیا کو دیکھنے کے قابل بناتا ہے۔ ایشور کی کوئی شکل نہیں۔ ہر جگہ موجود ہے۔ صاف و شفاف دلوں میں داخل ہوتا ہے۔ اس کو زمانہ محیط نہیں کر سکتا۔'

(مذکورہ کتاب، ص: 87)

یہی نہیں اسلام کے تعلق سے بھی محترمہ پرتیبھا رائے کا نظریہ بالکل شفاف ہے۔ اس کا اندازہ 'مقدس رات' کے پڑھنے سے ہوتا ہے۔

اس افسانے میں انھوں نے اسلام کے بارے میں جتنی معلومات اڑیا قارئین کے لیے پیش کی ہیں وہ بالکل درست ہیں۔ یہ افسانہ ایک مسلم کردار ممتاز الدین کے اطراف بنا گیا ہے۔ ممتاز الدین، سراج الدین کا بیٹا ہے جو ایک راسخ مسلمان ہے۔ ممتاز الدین کی پرورش اسلامی ماحول میں ہوئی ہے۔ یہ لڑکا ایک ہوٹل میں کام کرتا ہے۔ رمضان کا مہینہ۔ عید قریب ہے۔ اسے ہوٹل کا کام نمٹا کر لوٹنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ شہر کے حالات خراب ہیں۔ ایک رات وہ اپنے ایک اور ساتھی جس کا نام رام رحیم ہے کے ساتھ دیر رات گئے گھر لوٹتا ہے تو راستے میں پولس انھیں روکتی ہے اور ان پر شک کرتی ہے کہ وہ دہشت گرد ہیں۔ نام پوچھتی ہے۔ رام چالاک ہے وہ اپنے نام کو مصلحت اور موقع کے لحاظ سے استعمال کرتا ہے اور ممتاز الدین کو بھی مشورہ دیتا ہے کہ وہ اپنا نام غلط بتائے۔ وہ تو اپنا نام رام بتا کر فرار ہو جاتا ہے مگر ممتاز الدین سچ کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ ایک تو روزہ دار ہے اور رمضان کا مہینہ ہے اس کا ضمیر جھوٹ کی اجازت نہیں دیتا وہ اپنا نام درست بتاتا ہے۔

اس افسانے میں انھوں نے حقیقت سے نقاب ہٹایا ہے۔ ان کے علاوہ ایکسیڈنٹ میں انسان کا پچھتاوا جو اسے پاگل خانے تک لے جاتا ہے۔ 'بھوک' میں انھوں نے 'بھوک' کو اسور کا روپ دیا ہے۔ یہ کہانی اتنی پر مغز اور بحث طلب ہے کہ اس پر ایک الگ مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ یہ بھوک دراصل کسی فرد واحد کی بھوک نہیں ہے بلکہ آج کے سماج اور معاشرے کی بھوک ہے۔ نہ اولاد باقی رہتی ہے اور نہ خاندان۔ صرف بھوک: دولت کی بھوک، عزت کی بھوک، شہرت کی بھوک، اثر و رسوخ کی بھوک، کرسی کی بھوک، صرف بھوک ہی بھوک۔ حتیٰ کی انسان اپنی قدر کھو چکا ہے۔ اس کے اندر ایک ہولناک قحط پڑ گیا ہے جہاں وہ غذا نہ ملنے کی صورت اپنوں کے خون سے پیاس بجھا سکتا ہے۔ الغرض جلاد، حرامی، قاتل، ان ساری کہانیوں میں محترمہ کا قلم جولانیاں بکھیر رہا ہے۔

المختصر- اس انتخاب میں شامل افسانوں کو پڑھ کر میں یہ اعتراف کرتی ہوں کہ پرتیبھا رائے ایسے سماج کی تجسیم کرنا چاہتی ہیں جس میں محبت ہو، اخوت ہو، بھائی چارہ ہو، رشتوں کا تقدس ہو، آدمی آدمی کا دوست ہو اور مذہب کے نام پر منافرت نہ ہو کیونکہ انسانیت سے بڑا کوئی اور مذہب نہیں ہے۔ حق گوئی خواہ نسلی امتیاز کے بارے میں ہو یا مذہب یا پھر اخلاقی گراوٹ، ان میں ان کا قلم تھرتھراتا نہیں ہے۔ میں یہاں اڑیا ادب کے نامور نقاد پنڈا کی رائے۔ 'بنیاد پرستی اور شدت پسندی پر حملہ کرتے ہوئے موصوفہ انسانیت کی ایک نئی بنیاد قائم کرنے کی متمنی نظر آتی ہیں۔ انسانیت کی نئی بنیاد قائم کرنے کی ایسی کوشش پوری دنیا نیز ہندوستان میں عنقا ہے' سے سو فی صد متفق ہوں۔

جن فنکاروں نے فرد کو بحیثیت انسان یا باشعور سماجی رکن، اس کی تمام تر واجبات میں دیکھا ہے اور اس کی ذات کو تہہ در تہہ، پرت در پرت اکھاڑنے کی ہمت کی ہے، وہی اپنے فن کو معنویت دے سکے ہیں۔

'کسب مال کن کہ عزیز جہاں شدی'

(کسی ہنر میں کمال حاصل کر، تاکہ دنیا میں ہر دل عزیز ہو)

ان کہانیوں میں سب سے الگ بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ کہ محترمہ بحیثیت راوی (خود فنکار) اپنے کرداروں سے کہلواتی ہیں۔ ہر تخلیق کے پیچھے اس کے مصنف کی سائیکی کام کرتی ہے اور جو پیغام وہ دینا چاہتا ہے بین سطور کہتا ہے۔

پرتیبھا رائے بھی یہی کرتی ہیں مگر معاملہ تھوڑا سا مختلف ہے۔

محترمہ ایک اچھی Psycho Analist ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کی تجسیم کچھ اس طرح کرتی ہیں کہ کردار بولتے ہیں اور وہ چپ رہتی ہیں۔ یہ بات انھیں اوروں سے ممیّز کرتی ہے۔

یہ تو کچھ باتیں اور کچھ احساسات تھے جو اس ناچیز نے اپنی ذمہ داری سمجھ کر سپرد قلم کیے ہیں۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے ایک نابغۂ روزگار ادیبہ کی تخلیقات پر لب کشائی کا موقع ملا ہے۔ یہ میری خوش نصیبی ہے۔

ترجمہ: محض لفظوں کے پھیر بدل کا نام نہیں کیونکہ ایک زبان کے ادب کو دوسری زبان کے ادب میں منتقل کرنے کے لیے ادیب کو اس زبان اور معاشرے سے واقف رہنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ لفظ معاشرے میں پنپتے ہیں۔ اس کی ساخت، اس کے استعمال کا طریقہ، لفظ کی بود و باش، لفظ کا تیکھا پن، اچھا پن، اس کی شوریدہ سری، احتجاج، مکان و زماں کا یقین صرف معاشرہ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مترجم کو سنکڈ کیڈ (Synecdoche) یعنی کل کو جزو میں اور جزو کو کل میں تبدیل کرنے کے ہنر سے بھی واقف رہنا ضروری ہے۔ جامی صاحب نے یہ کر دکھایا ہے۔

جامی صاحب نے نہایت محبت شاقہ سے یہ ترجمہ کیا ہے۔ یہ اس لیے بھی ممکن ہوا کہ موصوف نہ صرف اڑیا زبان سے واقف ہیں بلکہ وہ خود بھی تخلیقی فن کار ہیں۔ اس لیے انھوں نے بڑی روانی سے یہ ترجمہ کیا ہے اور کہانی کی روح کو مجروح نہیں ہونے دیا گرچہ اس کوشش میں کہیں کہیں عبارت طویل ہوگئی ہے۔ میں محترم جامی صاحب کی محنت کی داد دیتی ہوں۔ شاید اسی قلم سے ان کا رشتہ کھانا پانی جیسا ہے یعنی ......نہ لکھیں تو جئیں کیسے؟

میں انھیں اس کامیاب کوشش پر مبارک باد دیتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ خدا انھیں توفیق دے کہ کبھی اردو کہانیوں کو بھی اڑیا قارئین سے متعارف کروائیں۔ بس یہ ایک ذرا سی خواہش ہے۔ اظہار کیا، انتظار رہے گا۔

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے

(غالب)

□□□

Qamar Jamali
Rahat Kada
H. No. 4-5,
Himagiri Nagar Colony
Gandamguda
Hyderabad-500091 (Telangana)

محمد دانش غنی

بانو سرتاج کی کہانیاں

ایک زمانہ تھا کہ بچوں کے ادب پر کم کم ہی لکھا جاتا تھا۔ وہ اس لیے کہ لکھنے والے یہ سمجھتے تھے کی بچوں کے لیے لکھنا بڑا مشکل کام ہے لیکن بچوں کے لیے لکھنا بھی ضروری ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لکھنے والے اور پڑھنے والے کے درمیان کتنی ذہنی ہم آہنگی ہے۔ ذہنی ہم آہنگی کی غیر موجودگی میں بڑے سے بڑا ادب پارہ بھی الفاظ کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے۔ خاص طور سے بچوں کے لیے لکھنے میں مصنف (یا جو کوئی بھی ہو) کو اپنا ذہنی سفر اسی راستے پر پیچھے کی طرف طے کرنا پڑتا ہے جسے وہ بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا اور یہ ایک مشکل ترین کام ہے۔ شاید یہی وہ وجہ ہوگی جس کی بنا پر بڑے سے بڑے فنکار نے بچوں کے لیے کم لکھا یا پھر لکھا ہی نہیں۔ اکثر ہم نے یہ پڑھا ہے کہ ''بچوں کے ادب کی تخلیق، ادب کی دوسری اصناف کی طرح خون کا اخراج مانگتی ہے۔ اس کے لیے عرق ریزی اور جگر کاوی اولین شرائط ہیں'' یا ''جب تک آدمی خود بچہ نہ بن جائے تب تک وہ بچوں کے لیے اچھی چیز لکھ ہی نہیں سکتا'' یا پھر ''لوگ یہ سوچ کر لکھتے ہیں کہ میاں بچے کو بہلانا کون سی مشکل بات ہے۔''

بچکانہ تحریروں، توہم اور خام خیالی کی پرورش کرنے والے قصوں کہانیوں اور لفظوں کے الٹ پھیر سے تخلیق ہونے والے ادب کو بچوں کا ادب نہیں کہا جا سکتا۔ بچوں کا ادب بھی ادب کی عمومی تعریف سے باہر نہیں ہے یعنی احتساب کی تحریک اور انبساط کا حسول جو ادب کی بنیادی شرط ہے بچوں کے لیے تخلیق کیے گئے ادب کے لیے بھی ضروری ہے۔ پانچ سال تک کی عمر کے بچے پڑھ نہیں سکتے، انھیں صرف کہانیاں اور نظمیں سنائی جا سکتی ہیں وہ بھی اشاروں میں، کچھ ایسے لفظوں میں جو ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو جلا بخشیں۔ سات سال کی عمر کے بچے عموماً عبارت پڑھنے لگتے ہیں مگر لفظوں سے ان کی واقفیت کم ہوتی ہے اس لیے جو نثر و نظم پانچ سات سال سے تیرہ چودہ سال تک کے بچوں کے لیے لکھی جائے وہ ان کی ذہنی سطح، میلانِ طبیعت اور زبان و بیان سے ارتقا پزیر تعلق کو مدنظر رکھتے ہوئے اس طرح لکھی جائے کہ بچے ان کو پڑھتے ہوئے لطف اندوز ہوں، نئے الفاظ ان کے ذہن میں محفوظ ہوں اور لفظ و معنی کے رشتوں سے ان کی بتدریج واقفیت حیات و کائنات کے اسرار کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو۔ یہی بچوں کا ادب ہے۔

محبوب راہی، عبدالرحیم نشتر، بانو سرتاج، حیدر بیابانی، محمد شرف الدین ساحل اور وکیل نجیب ودربھ کے وہ ہمعصر شعرا و ادبا ہیں جنھیں بچوں کے ادب میں اعتبار حاصل ہے اور ہم انھیں کسی حد تک تازہ کار اور وقت کے تقاضے کی تکمیل کرنے والے ہمہ جہت فنکار قرار دے سکتے ہیں۔ محبوب راہی، عبدالرحیم نشتر، حیدر بیابانی اور محمد شرف الدین ساحل نے جہاں مختلف موضوعات پر نظمیں کہہ کر بچوں کے ادب کو محض مذہب و اخلاقیات کے دائرے میں قید ہونے سے بچالیا وہیں وکیل نجیب نے کمپیوٹان جیسا ناول لکھ کر بچوں کے ادب کو اکیسویں صدی میں قدم رکھنے کے لائق بنایا۔ اس تناظر میں بانو سرتاج کو بچوں کے ادب کے دانشور فنکار

کے طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ ان کے یہاں تنوع بہت ہے۔

بانو سرتاج نے افسانہ نگار کی حیثیت سے ادبی دنیا میں قدم رکھا تھا اور افسانہ نگاری میں اپنی ایک پہچان بنالی تھی لیکن وہ تنقید، تحقیق، تراجم، مزاح نگاری اور ڈرامہ نویسی کے راستوں پر چل کر ادبِ اطفال کی منزل پر پہنچ گئیں اور ہندوپاک کی ممتاز اور قد آور ادیبہ کہلائیں۔ علاوہ ازیں ادبِ اطفال کے حوالے سے انھیں اکیسویں صدی کی نمائندہ فنکار کے طور پر تسلیم بھی کیا گیا جس کا ثبوت ساہتیہ اکاڈمی، نئی دہلی کا ادبِ اطفال ایوارڈ ہے جو انھیں 2015 میں دیا گیا۔ انھوں نے بچوں کے لیے ناول بھی لکھا جو ''جنگل میں منگل'' کے عنوان سے 1997 میں شائع ہوا جو ایک مہماتی اور دلچسپ ناول ہے۔ ''ایک بیمار سوانار (1996)''، ''وطن کے لیے (2005)'' اور ''آئی، برسات آئی (2005)'' بچوں کے لیے لکھے گئے ڈراموں کے مجموعے ہیں جن میں بچوں کے کردار، ان کے مسائل، ان کے حقوق اور ان کی نفسیاتی پیچیدگیوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ وہ بڑی خلاق ذہن کی مالک ہیں۔ ان کے قلم میں روانی بھی ہے اور زبان میں جولانی بھی۔ وہ ایک عرصے سے بچوں کے لیے لکھ رہی ہیں اور آج تک جو کچھ بھی لکھا، وہ بچوں کی نفسیات کو ذہن میں رکھ کر ہی لکھا ہے۔

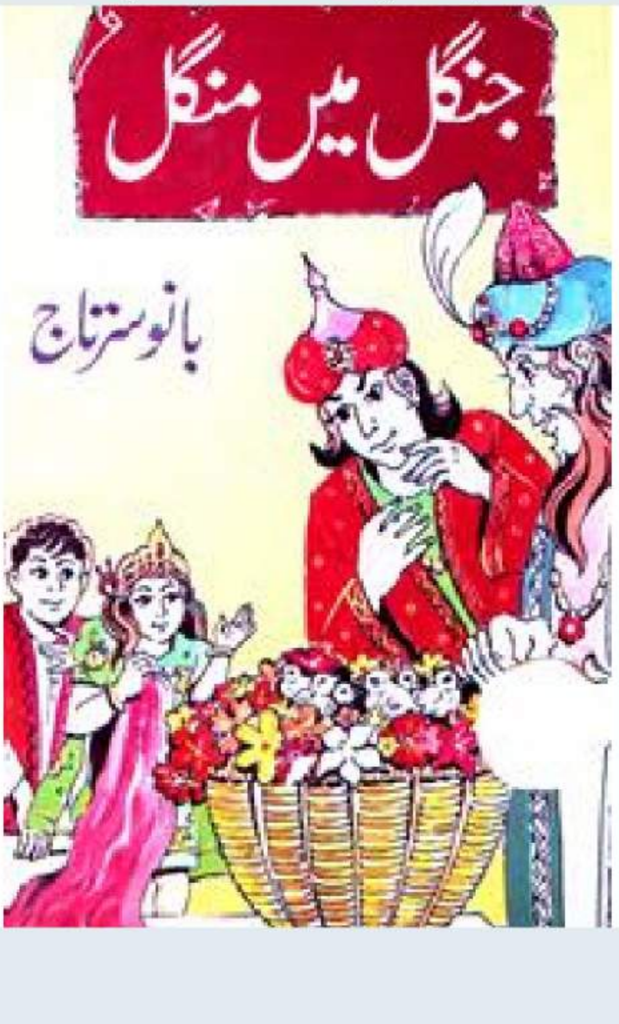

''ممی نا بولی!'' اور ''بڑا مزا اس ملاپ میں ہے'' بانو سرتاج کی کہانیوں کے مجموعے ہیں جو 2006 میں شائع ہوئے ہیں۔ دونوں مجموعوں کی کہانیاں خالص بچوں کی کہانیاں ہیں جنھیں پڑھ کر بچے نہ صرف راحت اور مسرت محسوس کریں گے بلکہ ان کے دل و دماغ میں کوئی بات، کوئی نصیحت بھی گھر کر چکی ہوگی۔ یہ کہانیاں سبق آموز ہی نہیں، ادب اور تہذیب آموز بھی ہیں۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر بے ساختہ کہا جاسکتا ہے کہ بانو سرتاج کو کہانی کہنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر عمر کے بچے کی نفسیات سے بخوبی واقفیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے بڑے دلچسپ انداز میں کہانیاں لکھیں۔ ان کی تخلیقات کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے ذریعے بچوں میں قومی ایکتا، حب الوطنی، انسان دوستی اور فرض شناسی کے جذبے کو عام کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

بانو سرتاج نے بچوں کے لیے کہانی لکھتے وقت بچوں کی مختلف عمر کا لحاظ بھی رکھا ہے۔ جیسے ''ممی نا بولی!'' کی کہانیاں چھوٹے بچوں کے لیے اور ''بڑا مزا اس ملاپ میں ہے'' کی کہانیاں بڑے بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔ انھوں نے ماخوذ روایتی کہانیاں بھی لکھی ہیں اور طبع زاد کہانیاں بھی۔ دونوں کہانیوں کے کردار بچے اور جانور ہیں۔ کہانیوں میں بچوں کے لیے دلچسپی اور تفریح کے ساتھ کردار سازی پر زور دیا گیا ہے۔ سچ کی فتح، نیکی کی جیت، اپنے فرض کی ادائیگی، توکل، قناعت، خدا کا شکر، بزرگوں کا احترام، استاد کی دی ہوئی تعلیم پر چلنا، بچوں کے حقوق، ان کی مسائل وغیرہ بانو سرتاج کی کہانیوں کے موضوعات ہیں۔ ممی نا بولی، جیسے کو تیسا، بڑا کون، پیار بانٹتے چلو، گھمنڈی کا سر نیچا، بے زبان ساتھی، روبوٹ، ننھا فرشتہ، پیارا بچپن، صوفی کی باتیں، بڑ بولا کھجور، سونو کا انعام، ایمانداری کا پھل، صبح کا بھولا، تھوڑا سا پیار، سچا دوست، سزا، سالگرہ کا تحفہ، دو بھائی ان کی ایسی ہی نمائندہ کہانیاں ہیں جن کے عنوانات سے ان کی دلچسپی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

''ممی نا بولی!'' نامی مجموعہ کی کہانیاں مختصر انداز میں تخلیق کی گئی ہیں لیکن ہر کہانی نیک اور صالح مقصد لیے ہوئے ہے۔ مجموعہ کی پہلی کہانی ''ملاپ'' ہے جس میں مصنفہ نے بوڑھی چیل کے ذریعہ کوئل یعنی ککو کے گھمنڈ کو دور کرنے کے ساتھ آپسی بھائی چارے کے جذبہ کو بڑی خوبصورتی سے ابھارنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ''کہانی میں کہانی'' میں بچوں میں پیڑ لگانے کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ ''نئی دنیا'' میں ہمدردی اور حوصلہ مندی کی بات کہی گئی ہے۔ ''بلاکی اور بڑھیا'' ایک کاہل بندر کی کہانی ہے جس کا نام بلاکی ہے اور وہ روز اپنی کاہلی کے سبب بیوی کی ڈانٹ کھاتا ہے۔ ایک دن اس نے طے کیا کہ اب وہ کام کرے گا اور رات میں ہی

درخت کے پتوں کو گرا کر ایک جگہ جمع کر دے گا۔ پھر اس نے درختوں کے پتوں کو گرا کر زمین پر ایک قسم کا غالیچہ بنالیا تا کہ اس کے بچے چھلانگ لگاتے وقت اگر گرے تو چوٹ نہ آئے لیکن صبح جب بلا کی دیکھتا ہے تو وہ پتے اس جگہ سے غائب رہتے ہیں جہاں وہ رات میں جمع کر کے رکھتا ہے۔ ایک رات وہ جاگتا ہے اور ایک بڑھیا کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیتا ہے۔ بڑھیا اپنے کیے پر شرمندہ ہوتی ہے اور اس سے معافی مانگتے ہوئے کہتی ہے کہ میں ان پتوں کو بیچ کر اپنا پیٹ پالتی ہوں۔ بلا کی کو اس پر رحم آتا ہے اور اب وہ روز آنہ اس کے لیے درخت سے پتے توڑ کر ایک جگہ جمع کر دیتا ہے اور بڑھیا ان پتوں کو بازار میں بیچ کر اپنی گزر بسر کرتی ہے ساتھ ہی وہ بلا کی کو خوب دعائیں بھی دیتی ہے۔ اب بلا کی کاہلی چھوڑ کر کام کرنے لگتا ہے جس سے اس کی بیوی بھی خوش رہتی ہے۔ اس کہانی سے بچوں کو یہ پیغام ملتا ہے کہ ''ہے کام آدمی کا اوروں کے کام آنا'' یا ''دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو'' جو ایک خوبصورت پیغام ہے۔

ایک تین سالہ معصوم بچہ کے اردگرد گھومتی ہوئی کہانی ''ممی نا بولی!'' ہے جس کے ہیرو فاروق میاں ہیں (جو تین سال کے ہیں)۔ فاروق میاں کا تکیہ کلام ''ممی نا بولی'' سے سارا محظوظ ہوتا رہتا ہے لیکن ان کی دادی کو یہ عادت اچھی نہیں معلوم پڑتی اور وہ اسے فاروق میاں سے چھڑانا چاہتی ہے۔ دادی کے کہنے پر فاروق میاں کا تکیہ کلام سارا گھر بولنے لگتا ہے جس سے فاروق میاں اپنے تکیہ کلام بولنا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ کہانی بڑی معصوم اور نہایت ہی خوبصورت ہے اور میرے خیال سے یہ مجموعہ کی سب سے اچھی کہانی ہے اسی لیے بانو سرتاج نے اس کہانی کو مجموعہ کا نام دیا ہے۔ ایک ذرا سی بات کو انھوں نے کہانی کا موضوع بنا کر اس طرح پیش کیا ہے کہ پڑھنے والے کو وہ اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ یہی حال ان کی تمام کہانیوں کا ہے۔ اس مجموعہ میں بچوں کے لیے اور بھی بہت سی خوبصورت کہانیاں شامل ہیں جن میں بچوں کی تربیت اور ان کی کردار سازی کا سامان موجود ہے۔

''بڑا مزا اس ملاپ میں ہے'' اصلاحی و اخلاقی کہانیوں کا مجموعہ ہے جو بڑے یا مخصوص عمر کے بچوں کے شعور کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھی گئی ہیں۔ مجموعہ کی کہانیاں بیداری پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ حرکت و عمل پر بھی اکساتی ہیں۔ ''بڑ بولا کھجور''، ''سونو کا انعام''، ''انوکھی شرارت''، ''بن کانٹوں کا گلاب''، ''انوکھی بی بی''، ''سالگرہ کا تحفہ'' بانو سرتاج کی ایسی ہی نمائندہ کہانیاں ہیں جن کے سحر میں قاری کھو جاتا ہے۔ مجموعہ کی دوسری کہانیاں بھی یہی خوبی اور خصوصیت رکھتی ہیں۔

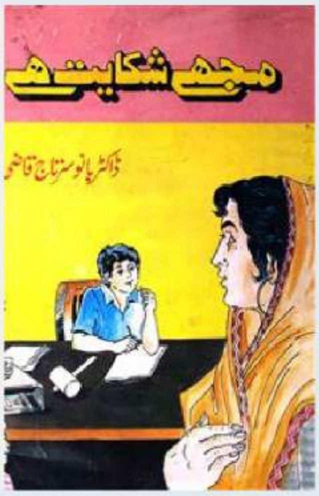

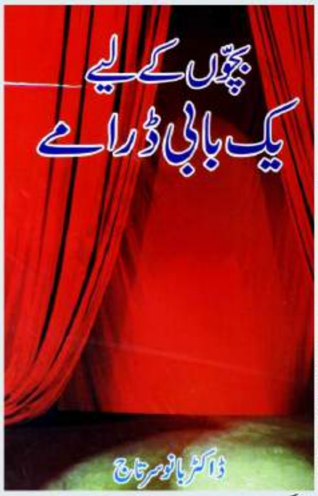

بانو سرتاج نے اپنے آس پاس بکھرے ہوئے موضوعات سے اپنی کہانیوں کے تانے بانے بنے ہیں۔ ان میں کردار بھی وہی ہیں جو ہمارے اطراف میں پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں مافوق الفطرت عناصر اور طلسمی واقعات کو قطعی شامل نہیں کیا ہے۔ ان کی کہانیاں زندگی کی کڑوی سچائیاں پیش کرتی ہیں اور بچوں میں عزم و حوصلہ پیدا کرتی ہیں۔ یہ کہانیاں بچوں میں ایک ایسے کردار کی تعمیر کرتی ہیں جو سماج کے لیے مثالی ہو۔ ان کی زبان بچوں کی اپنی زبان ہے اور اسلوب کی دلکشی ان کی کہانیوں کی نمایاں خوبی ہے۔ کہانیوں کے چند اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

> ''انس میاں ڈیڑھ سال کے ہونے جا رہے تھے مگر مجال ہے جو ایک لفظ بھی بولنا سیکھے ہوں۔ اور باتوں میں تو جیسے سب کے اندازوں کو غلط ثابت کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا تھا۔ ہوئے تھے ایسے سینک سلائی کہ ان کی امی کو گود میں اٹھاتے ڈر لگتا تھا۔ وہ کہتی تھی 'ہائے کیا ایسا سینکیا پہلوان ہی رہ جائے میرا بچہ!' مگر دیکھتے دیکھتے وہ گول لڈو بن گئے تھے۔ ان کے گھٹنوں گھٹنوں چلنے سے سب پوری طرح محظوظ نہ ہوئے تھے کہ کھڑے ہونے لگے اور پھر بھاگنے بھی لگے۔''

(کہانی ''بھادو رے! بھادو!''، ممی نا بولی!، صفحہ نمبر 26)

****

> ''راجا کے پاپا اسے لے کر دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس گئے۔ معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے سخت ہدایت دی کہ راجا کو میٹھا زیادہ نہ کھانے دیا جائے۔ اس کے بہت سے دانت خراب ہو چکے ہیں۔ راجا تو میٹھے کا کیڑا تھا۔ اسے میٹھا کھانے سے روکا جاتا مگر وہ کسی کی نہیں سنتا تھا۔ ممی عاجز آ جاتیں۔ کھانا کھانے بیٹھتا تو دودھ روٹی مانگتا۔ ناشتے میں جلیبی کی مانگ

کرتا۔ٹفن میں روز میٹھا پراٹھا ہی رکھنے کی ضد کرتا۔یہی نہیں جو جیب خرچ ملتا اس سے امرتی جلیبی خرید کر کھاتا۔"

("کھلا دو سونے کا نوالہ"، بڑا مزا اس ملاپ میں ہے، صفحہ نمبر 15)

یہ زبان عام فہم ہے جسے بچے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔بول چال کی یہ زبان سادہ، سلیس اور لچکدار ہے جس میں بلا کی کشش ہے۔بانو سرتاج کی زبان، عنوان اور موضوع سے بہت مناسبت رکھتی ہے یعنی ان تینوں میں زبردست ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ان کے بیانیہ کا شفاف پن جسے برتاؤ کے اعتبار سے ہم ڈرامائی بیانیہ بھی کہہ سکتے ہیں، ڈرامائی انداز اور داستانوی تکنیک کی آمیزش سے انھوں نے کہانیوں کو بے حد دلچسپ بنا دیا ہے جن میں بچوں کے لیے دلچسپی، تحیر اور تجسس کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔واقعات کا ربط، تسلسل اور مناظر کی ترتیب بھی بہت قرینے سے کی گئی ہے۔وہ اپنی کہانی اور حکایت کے ذریعہ کہنا چاہتی ہیں اس لیے ان کے یہاں کہانی میں کہانی ملتی ہے۔مثال کے طور پر "کہانی میں کہانی" میں دادا جان سنی کو کہانی سناتے ہیں اور پھر اسی میں سے کہانیاں نکلتی چلی جاتی ہیں۔"پیار بانٹے چلو" میں بھی ایسا ہی ہے۔یہی حال "گھمنڈی کا سر نیچا"، "اڑان کا انجام"، "بڑا مزا اس ملاپ میں ہے"، "میں کس کے ساتھ کھیلوں؟" اور "صبح کا بھولا" میں بھی ہے۔

عبدالرحیم نشتر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اچھی کہانی کی خوبی یہ ہے کہ اسے پڑھنا یا سننا شروع کریں تو بس پڑھتے یا سنتے ہی چلے جائیں، جب تک کہانی پوری نہ ہو۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ بانو سرتاج کی کہانیاں اچھی ہیں جنھیں پڑھنا یا سننا شروع کریں تو بس پڑھتے یا سنتے ہی چلے جائیں۔

OOO

Dr. Mohd. Danish Gani
Dept. of Urdu
Gogate Jogalekar College
Ratnagiri - 415 612 (M.S)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/ چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................. بتاریخ..................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

محمد عامل بدایونی

تانیثیت

معنی، مفہوم اور ضرورت

تانیثیت دور حاضر کا ایسا اہم ترین موضوع ہے جو ادب میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ مرد اور عورت دونوں ہی اس سماج کے اہم رکن ہیں۔ عورت کے بنا مرد اور مرد کے بنا عورت کا تصور ممکن نہیں۔ قدرت اور سماج نے عورت کو مرد کے برابر حقوق دیے ہیں لیکن تانیثیت پسندوں کا کہنا ہے کہ اس سماج میں عورتوں کی حق تلفی کی گئی ہے۔

تانیثیت کی تحریک عورتوں کو انصاف اور حقوق دلانے اور ان کے مسائل و شخصیت کی بحالی کے لیے شروع کی گئی، جو ہر ملک میں اپنے سماجی، معاشرتی اور تہذیبی حالات کے زیر اثر مختلف جہتوں میں رونما ہوتی رہی اور الگ الگ صورتوں میں اس کو فروغ ملتا رہا۔ یہ ایسی تحریک ہے، جو خصوصاً عورتوں سے وابستہ ہے۔ یہ تحریک صدیوں سے چلی آرہی عورتوں کی زبوں حالی کے خلاف احتجاج ہے۔ اس سلسلے میں خلیل احمد بیگ یوں رقم طراز ہیں:

> ”دنیا میں انسانی مساوات کے قیام کی خواہش قوموں کے دلوں میں اکثر پیدا ہوتی رہی ہے۔ اسی کی ایک نمایاں شکل عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق تفویض کیے جانے کی جدو جہد ہے۔ جس نے مغرب میں انیسوی صدی کے دوران ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ حقوق نسواں کی اس تحریک کو تانیثیت کا نام دیا گیا۔“

(خلیل احمد بیگ، تانیثیت، اردو ادب میں تانیثیت کی مختلف جہتیں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2014، ص 64)

تانیثیت آج ایک ایسا موضوع بن چکا ہے جس پر کئی نامور ادبا، شعرا اور مفکرین نے اپنا قلم اٹھایا ہے اور وہ ادب کے ذریعہ اس تحریک کے ساتھ ہم آواز ہو رہے ہیں۔ ادبی حلقے میں آج تانیثیت کی گونج صاف سنائی دے رہی ہے۔ اس حوالے سے کئی تصانیف منظر عام پر آتی رہی ہیں اور ابھی بھی آب و تاب کے ساتھ دانشوروں اور مفکروں کا قلم جاری و ساری ہے۔ عورتوں کے سماجی، سیاسی، نفسیاتی، جنسی، معاشی، معاشرتی اور ذہنی مسائل پر یوں تو بہت کچھ قدیم زمانے سے ہی لکھا جاتا رہا ہے لیکن دور جدید میں اس طرف زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔

تانیثیت کے لیے انگریزی میں ”Feminism“ لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے، جو ایک جدید اصطلاح ہے۔ یہ لاطینی زبان کے لفظ ”Femina“ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی نسوانی اوصاف رکھنا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ لفظ ”Feminism“ کا استعمال کب اور کیسے ہوا؟ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس لفظ کا سب سے پہلے استعمال فرنچ میڈیکل ٹکسٹ میں 1871 میں کیا گیا تھا یعنی اس لفظ کا استعمال ابتدا میں ایسے لوگوں کے لیے کیا جاتا تھا جن میں کسی وجہ سے نسوانی اوصاف پیدا ہو جاتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد فرانس کی ایک تخلیق کار ”Alexander Dumas fils“ نے ایک کتاب لکھی جس میں انھوں نے لفظ ”Feminist“ کا استعمال ایسی عورتوں کے لیے کیا جو بیباک ہوتی تھیں اور بہادر مزاج رکھتی تھیں۔ ابتدا میں ”Feminist“ کا استعمال نسوانی

اوصاف کے بیان کے لیے کیا گیا لیکن کچھ عرصے کے بعد اس کے معنی میں بدلاؤ آیا اور یہ ایسے لوگوں کے لیے استعمال ہونے لگا جو حقوق نسواں کے لیے جدو جہد کر رہے تھے۔ ابتدا میں یہ ایک مخصوص رجحان تھا لیکن بعد میں یہ آہستہ آہستہ ایک رجحان سے تحریک تک کا سفر طے کرنے لگا۔ پھر یہ اصطلاح تانیثیت یا تانیثی تحریک کے نام سے فروغ پانے لگی۔

اس مطالعے میں اس امر پر گفتگو کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آخر تانیثی تحریک کیوں کر وجود میں آئی؟ اور وہ کون سے عوامل کارفرما تھے جن سے اس تحریک کو ترقی حاصل ہوئی۔

تانیثیت ایک عورت کے شعور ذات کا اظہار ہے کیوں کہ اس میں یہ احساس بھی بہت حد تک شامل ہے کہ عورتوں کو تاریخ سے باہر رکھا گیا۔ ان کو وہ مواقع فراہم نہیں کیے گے جن سے وہ اپنی قابلیت کو منظر عام پر لا سکیں۔ اگر وہ کوشش بھی کرتی تو انھیں دبا دیا جاتا۔ لہٰذا مغرب میں عورتوں نے ایک الگ دنیا قائم کی جس میں وہ پوری طرح آزاد اور خود مختار تھیں اور جس میں مردوں کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ انھوں نے تحقیق و تاریخ اور شعر و ادب سے متعلق بے شمار کارنامے انجام دیے۔ ابتدا میں مختلف شعبوں جیسے لسانی، تاریخی، تہذیبی، اخلاقی، فلسفیانہ، مذہبی، سیاسی اور معاشی عوامل پر مردوں کی ہی بالادستی رہی اور عورتوں کو ان سے بہت حد تک دور رکھنے کی کوشش کی گئی۔

عورتوں کے مسائل پر یوں تو بہت سے مرد ادیبوں، مفکروں، دانشوروں اور شاعروں نے قلم اٹھایا ہے لیکن عورت جیسے حساس موضوع کے ساتھ انصاف کر پانا بہت کم قلم کاروں کو نصیب ہو پایا ہے۔ عورت ایک ایسا موضوع ہے جو حد درجہ اہمیت کا حامل ہے۔ عورت کو ہمیشہ محرومی کا شکار ہونا پڑا ہے۔ گھر کی چہار دیواری سے لے کر باہر کی کھلی فضا تک عورت مشکلات سے دو چار ہوتی رہی ہے۔ گھر اور سماج کا ایک اہم رکن ہوتے ہوئے بھی عورت کو مظلومی، محکومی، ظلم و تشدد کا شکار ہو کر ساری زندگی مصائب میں ہی گزارانی پڑی ہے۔ یہ صرف ایک ملک یا کسی ایک قوم یا خطے کی بات نہیں ہے بلکہ پوری دنیا میں عورت کو اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

عورت سے متعلق مختلف نظریات کا اگر ہم جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عورت سے متعلق قدیم نظریہ سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے کیوں کہ قدیم زمانے میں عورتوں کے حالات بہت بدتر تھے۔ ان کا کوئی مقام یا عزت نہیں تھی۔ ظلم و ستم گویا ان کی قسمت تھی، عورتوں سے متعلق قدیم نظریات میں تضاد پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اس کے ساتھ ہیں جنھوں نے عورتوں کی عظمت اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

تانیثیت پسندوں کا کہنا ہے کہ جنسی مساوات ایک طرح کی جنگ نہیں بلکہ مردوں سے ایک ایسی روایت کو توڑنا ہے جو ہمارے سماج میں برسوں سے بودی گئی ہے۔ سماج کو چاہیے کہ اس کی اہمیت کو محسوس کرے اور قبول کرے اور مرد زندگی کے ہم سفر ہیں اور سماج کو پہچان اور ترقی صرف مردوں سے نہیں بلکہ عورتوں سے بھی ملتی ہے۔ آج کی عورت نے برابری کی آواز اٹھانے کے حق کو طلب کیا ہے۔ یہ برابری تعلیم، نوکری، سیاست اور جائداد وغیرہ کے لیے ہے۔ یہ نعرے عورتوں کو آگے لانے کے لیے ہیں جو ان کی شخصیت میں تبدیلی لانے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

تانیثیت پسند یہ بھی کہتے ہیں کہ سماج نے عورت کو بیوی کا درجہ دیا ہے لیکن اسی سماج نے ایسے حالات بھی پیدا کر دیے کہ ایک عورت کو زن بازاری کا کردار بھی ادا کرنا پڑا اور داشتہ بن کر بھی زندگی گزارنی پڑی ہے۔ ظلم اور فرسودہ دم گھوٹنے والی روایات میں جکڑی عورت نہ تو چین سے سانس لے سکتی ہے اور نہ اپنی خواہشوں کی تکمیل کر سکتی ہے۔ ان سب کے باجود بھی اسی عورت پر سب سے زیادہ ظلم ڈھائے گئے اور ہر قدم پر اس کا امتحان لیا گیا ہے۔ ابتدا سے ہی اس کی زندگی ظلم و ستم، جبر و استحال زیادتیوں اور غم و یاس میں ڈوبی ہوئی ہے۔ کبھی اسے زمین میں زندہ دفن کیا گیا ہے تو کبھی اس کو اگنی پریکشا دینی پڑی تو کبھی پتی کے ساتھ چتا میں جل کرستی ہونا پڑا تو کبھی اس کو ماں کی کوکھ میں ہی مار ڈالا گیا اور جب اس سے بھی تسکین حاصل نہیں ہوئی تو اسے پیدا ہوتے ہی مار دیا گیا۔ کبھی اس کی مرضی کے خلاف اس کی جبراً شادی کر دی گئی حتیٰ کہ نابالغ اور کم عمر کی بچیوں کو بھی اس دلدل میں بے رحمی سے دھکیل دیا گیا۔ عورت کو اپنے وجود کے لیے بھی جنسی و نفسیاتی استحصال کا شکار ہونا پڑا ہے۔ کبھی دروپدی کے روپ میں اسے خاوند کا خدمت گزار ٹھہرایا گیا تو کبھی مرد کی جنسی تسکین کے لیے اسے دیوداسی بنناپڑا۔ مردوں نے اپنے ذہنی سکون اور وقت گزاری اور رنگین مزاجی کے لیے اس کا استحصال کرنا شروع کیا تو عورت کا ایک نیا روپ نرتکی بن کر سامنے آیا اور وہ مردوں کی عیاشی کا سامان بن گئی اور طوائف اور محفلوں کی شان بننے لگی۔

عورت کو سماج و معاشرے میں رہتے ہوئے اس کا ایک اہم حصہ ہوتے ہوئے بھی اس کو سماجی و معاشرتی حقوق سے محروم رکھا گیا۔ جیسے تعلیم حاصل کرنے، ان کو تجارت میں حصہ لینے، معاوضے کی برابری وغیرہ جیسے حقوق سے دنیا کے کئی ملکوں میں عورت محروم رکھی گئی ہے۔

سماج افراد کے اجتماع اور ان کے باہمی اشتراک و عمل کا نام ہے۔

اس اعتبار سے سماجی رشتوں کو ایک ایسے جال سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس کے بننے میں عورت اور مرد دونوں برابر کے شریک ہیں۔ نسل انسان کا فروغ اور ساتھ ہی تہذیب و تمدن کی ترقی مرد و عورت دونوں کے باہمی تعاون اور مشترکہ عمل پر مشتمل ہے۔ ان دونوں کے بنا، انسانی سماج کا وجود اور اس کا ارتقا ممکن نہیں۔ اس لیے ضروری ہوا کہ ان دونوں کی سماجی حیثیت کا تعین منصفانہ ہو۔

'عورت کو اس کی پہچان اور اس کی آزادی اور وہ تمام حقائق حاصل ہوں جن کے لیے وہ پیدائشی طور پر مستحق ہے۔ اس بیداری کا سب سے اچھا نتیجہ یہ ہوا کہ فرد اپنے حقوق سے بخوبی واقف ہو گیا اور اس کے حصول کے لیے وہ جدو جہد کرنے لگا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کوشش نے ایک اجتماعی تحریک کی شکل اختیار کرلی یہی بیداری عورتوں میں بھی رونما ہوئی۔ جس کی پہلی کوشش امریکہ اور برطانیہ میں منظر عام پرآئی اور پھر آہستہ آہستہ یہ تحریک پورے مغربی اور مشرقی ممالک میں تانیثی تحریک کے ماتحت اپنی جڑیں پھیلانے لگی اور اپنے مطالبات کے لیے آوازیں بلند کرنے لگی۔'

تانیثیت پسندوں کا کہنا ہے کہ کسی پدری معاشرے میں زندگی گزارنے کا ہی نہیں بلکہ سوچنے سمجھنے کا انداز مرداساس ہوتا ہے۔ اس میں اس بات کی مطلق پرواہ نہیں کی جاتی کہ مردوں کے لکھے ہوئے متن کو ایک عورت کے نقطۂ نظر سے بھی دیکھا گیا ہوگا۔ مگر یہاں تو عورت کے نقطۂ نظر کا مسئلہ بھی خاصا وضاحت طلب ہو جاتا ہے۔ پدرانہ معاشرے میں ایک عورت بھی مرد کے نقطۂ نظر سے نہ صرف زندگی گزارتی ہے بلکہ اس کے سوچنے سمجھنے کا انداز بھی مرداساس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس صورت حال میں عورت کے لیے مردوں کے قائم کردہ تصورات زن سے نجات حاصل کرنا اور ان کے متن میں ان عناصر کی نشاندہی کرنا چاہیے جو عورتوں کے لیے مفید ثابت ہو سکے۔

تانیثیت ان مسائل کے علاوہ عورتوں کے جن مسائل سے بحث کرتی ہے ان میں عورت کی ازدواجی زندگی، بے جوڑ شادی کا مسئلہ، جنسی تفریق کا مسئلہ، جنس پرستی کا مسئلہ، بیوہ عورت کا مسئلہ، عورت کی عزت و آبرو کا مسئلہ، قید کا مسئلہ اور مرداساس طبقے کے دوہرے رویے کا مسئلہ وغیرہ ہیں۔

عورت کو اس کی پہچان اور اس کی آزادی اور وہ تمام حقائق حاصل ہوں جن کے لیے وہ پیدائشی طور پر مستحق ہے۔ اس بیداری کا سب سے اچھا نتیجہ یہ ہوا کہ فرد اپنے حقوق سے بخوبی واقف ہو گیا اور اس کے حصول کے لیے وہ جدو جہد کرنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کوشش نے ایک اجتماعی تحریک کی شکل اختیار کر لی یہی بیداری عورتوں میں بھی رونما ہوئی۔ جس کی پہلی کوشش امریکہ اور برطانیہ میں منظر عام پر آئی اور پھر آہستہ آہستہ یہ تحریک پورے مغربی اور مشرقی ممالک میں تانیثی تحریک کے ماتحت اپنی جڑیں پھیلانے لگی اور اپنے مطالبات کے لیے آوازیں بلند کرنے لگی۔

عورتوں کے مسائل و حالات کو لے کر پہلا اعلانیہ انقلاب 1792ء میں فرانس میں ہوا جسے تانیثیت کی پہلی لہر کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا انقلاب تھا جس نے نہ صرف فرانس بلکہ پوری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اس کے اثرات دیگر ملکوں پر بھی رونما ہوئے۔ انقلاب فرانس سے جہاں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں، وہیں دوسری طرف اس کا فائدہ عورتوں کو بھی ہوا۔ اس میں عورتوں کے حقوق کو لے کر بھی باتیں کی گئیں، ان کو پستی سے نکال کر مردوں کے شانہ بہ شانہ آگے بڑھانے پر بھی زور دیا گیا۔ نکاح و طلاق کے سخت قانون کو بھی کم کیا گیا۔ انھیں معاشی حقوق کے لیے بھی منصفانہ رویے کے لیے آواز بلند کی گئی۔ عورتوں کی تعلیم پر بھی زور دیا گیا۔ ان جدید نظریات کے سامنے آنے سے خواتین کی قابلیتیں ابھر کر سامنے آنے لگیں اور ان کو نہ صرف ہمت ملی بلکہ اس طرح ایک مکمل راہ ہموار ہوئی۔

تانیثیت کی دوسری لہر 1848 میں شروع ہوئی۔ جس کا آغاز برطانیہ اور امریکہ میں ہوا۔ لوگ اپنی آزادی اور خودمختاری کے لیے سڑکوں پر آنے لگے تھے۔ حکومت نے پابندیاں عائد کیں تو عوام میں انفرادی طور پر انجمنیں قائم ہونے لگیں۔ اس بحران میں عورتوں نے بھی صدائیں بلند کیں۔ ادب اور شاعری میں یوں تو حقوق نسواں کے لیے جدو جہد ہو رہی تھی اب عورتیں کھل کر میدان میں آنے لگیں۔ اس طرح برطانیہ، فرانس اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملکوں میں خواتین کو لے کر احتجاجی صورت میں یہ تمام انجمنیں زور پکڑتی رہیں، جو آگے چل کر تانیثیت کی شکل میں ابھر کر سامنے آئیں۔

تانیثی تحریک کی تیسری لہر بیسوی صدی کی آخری دہائی سے ذرا قبل نمودار ہوئی۔ اسے جدید تانیثیت بھی کہتے ہیں۔ یہ دوسری تانیثی لہر کی ناکامی کے سبب وجود میں آئی۔ اس تحریک سے وہ نوجوان خواتین وابستہ ہوئیں جن کی عمر30۔40 سال کے درمیان تھی جس سے عورتوں کی ایک نئی شبیہ ابھر کر سامنے آئی۔ اب عورت طاقتور تھی اور اپنی جنسیت پر اسے خود اختیار تھا۔ تیسری لہر سے اس بات کا بھی احساس پیدا ہوا کہ عورت کا تعلق کسی بھی رنگ، نسل، طبقے، قومیت، مذہب، تہذیب اور ثقافت سے ہو لیکن وہ تانیثیت کے نام پر متحد ہیں۔

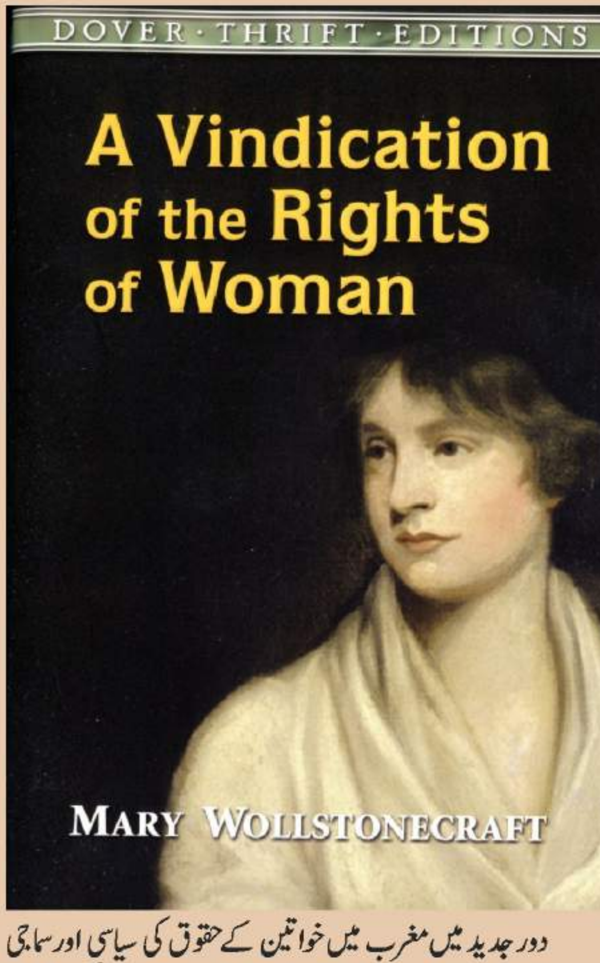

دورِ جدید میں مغرب میں خواتین کے حقوق کی سیاسی اور سماجی تحریک کے زور پکڑنے کے بعد ہی تانیثی ادب یا تانیثی تنقید کو صحیح معنوں میں فروغ حاصل ہوا۔ تانیثی جدوجہد کا صحیح معنوں میں آغاز اس وقت ہوا جب حقوق نسواں کے تحفظ کے لیے بعض عورتوں نے انفرادی طور پر آواز بلند کی اس ضمن میں برطانیہ کی ''میری والسٹون کرافٹ'' (Mary Wollstonescraft) کا نام قابل ذکر ہے۔ جنھوں نے اٹھاہوریں صدی کے نصف دہائی میں سماجی سطح پر عورتوں اور مردوں کے درمیان نابرابری کے خلاف آواز اٹھائی اور حقوق نسواں کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ میری کا کہنا تھا کہ عورتیں مردوں سے کم نہیں ہیں لیکن وہ کمتر اس لیے سمجھی جاتی ہیں کہ وہ تعلیم سے محروم ہیں۔ حقوق نسواں سے متعلق اس کی مشہور کتاب A vindication of the rights of woman" (1792)'' تانیثیت پسندوں کے لیے ایک اہم کتاب ہے۔ ان کی یہ کتاب دراصل ایڈمنڈ برک کی تصنیف "A vindiaction of rights of men(1790)" کے جواب میں آئی تھی۔ برک نے اپنی کتاب میں مردوں کے حقوق پر اصرار اور عورتوں پر اپنی بالادستی کے چلن کو درست ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ ''میری والسٹون کرافٹ'' کے بعد ہی حقوق نسواں کے تحفظ کے لیے منظم طور پر جدوجہد کا آغاز ہوا جس نے مغرب میں ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اس تحریک میں ابتداً عورتیں ہی پیش پیش رہیں لیکن بعد میں مرد بھی اس تحریک کا حصہ بنے۔ تانیثیت کی تاریخ میں 'سیفو'' کا نام بطور مصنفہ بہت اہم ہے۔ انھوں نے اس تحریک کی ابتدا ایک سماجی تحریک کی صورت میں کی تھی اور جس کی مانگ تھی کہ عورت کو مرد کے برابر درجہ دیا جائے۔ ''جان اسٹوراٹ مل'' کی مشہور تصنیف "On the subjection of women" نے تانیثیت کے باب میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ ''ورجیناوولف'' نے اپنی کتاب جو لکچرس کا مجموعہ ہے "A room of their ones own (1729)" میں ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں معاشرے میں عورت کی حیثیت کا ایک نئے زاویے سے تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''شیلا ربوتھم'' کی کتاب "Hidden from History" کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے، جو1973 میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں تانیثیت سے متعلق تحقیقی وتنقیدی موادفراہم کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں تانیثیت سے متعلق لکھی گئیں جن میں Literary A Literature ،The New Feminist Criticism ،Women of Virgin اور Gyno Criticism کے نام اہم ہیں۔ یہ کتابیں تانیثیت کو سمجھنے کے لیے ایک بہترین ذریعہ ہیں۔

مغربی ممالک میں ان خواتین نے اپنی تصنیفات کے ذریعے نہ صرف ان مسائل پر حکمرانوں اور ادیبوں کی توجہ دلائی، بلکہ اپنے تمام مسائل وحقوق کی فراہمی کے لیے مانگ بھی کی۔ ان مغربی خواتین نے اس ادب کو بھی مسترد کیا، جس میں عورتوں نے مردوں کے ساتھ نرم سلوکی، وفاداری کا مطالبہ کیا ہے۔ ان خواتین نے ایسا ادب تخلیق کیا جس میں ان کی خوداعتمادی، خودشناسی اور خودنمائی موجود ہو۔ بیسوی صدی کی دوسری دہائی کی ایک بے باک خاتون مصنفہ اور تانیثیت کی رہنما ''سیمن دی بوار''

کی تصانیف "The second sex" اور "The Prime of life" منظر عام پر آئیں۔ "The second sex" کو ''کشور ناہید'' نے ''عورت'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ اس تصنیف کے ذریعہ انھوں نے اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے کہ ادب سے لے کر تحقیقات تک ہر مقام پر مردوں کا ہی بول بالا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مرد اساس معاشرے کو ختم کیا جائے اور عورتوں کو بھی ان کے حقوق دیے جائیں۔

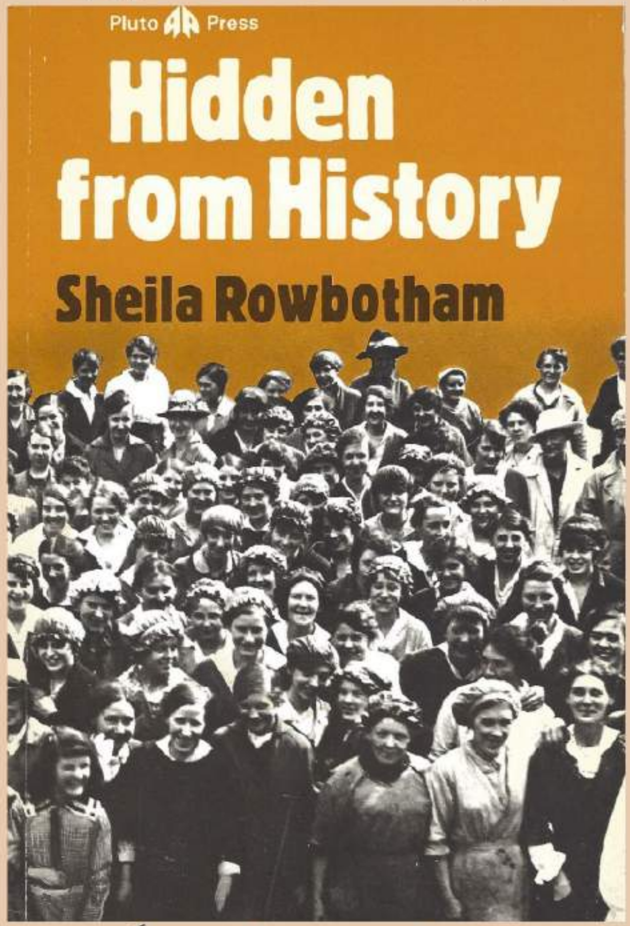

تانیثیت کی یہ آواز ہندوستان میں بھی تیز ہونے لگی۔ ہندوستان کی پڑھی لکھی خواتین اب نہایت سنجیدگی سے اس بات کو سوچنے لگیں کہ انھیں سماج میں مردوں کے مساوی حقوق ملنے چاہیے۔ اردو ادب میں یوں تو عورتوں سے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن جن مصنفین نے جرأت مندی کے ساتھ قلم اٹھایا ہے ان میں رشید جہاں، فہمیدہ ریاض، ترنم ریاض، قرۃالعین حیدر، عصمت چغتائی، جیلانی بانو، عذرا پروین، شہناز نبی، قمر جہاں، ذکیہ مشہدی، ترنم ریاض، شائستہ فاخری اور صغریٰ مہدی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اردو ادب میں تانیثیت کی سب سے بہترین مثال عصمت چغتائی کا ناول ''ٹیڑھی لکیر'' ہے۔ جس میں 'شمن' کے ذریعہ عورت کے مختلف روپ دکھائے گئے ہیں۔ اردو شعر و ادب میں نسائی ادب کا دائرہ بہت وسیع ہوتا چلا گیا ہے۔ خواہ وہ غزل ہو یا نظم یا دیگر اصناف شاعری۔ نثری اصناف میں ناول ہو یا افسانہ، ڈرامہ ہو یا غیر افسانوی ادب، ان تمام اصناف ادب میں عورتوں نے نہ صرف اپنے فن کا مظاہرہ کیا بلکہ اپنی خدمات سے اردو ادب کے دامن کو گراں بار کیا۔

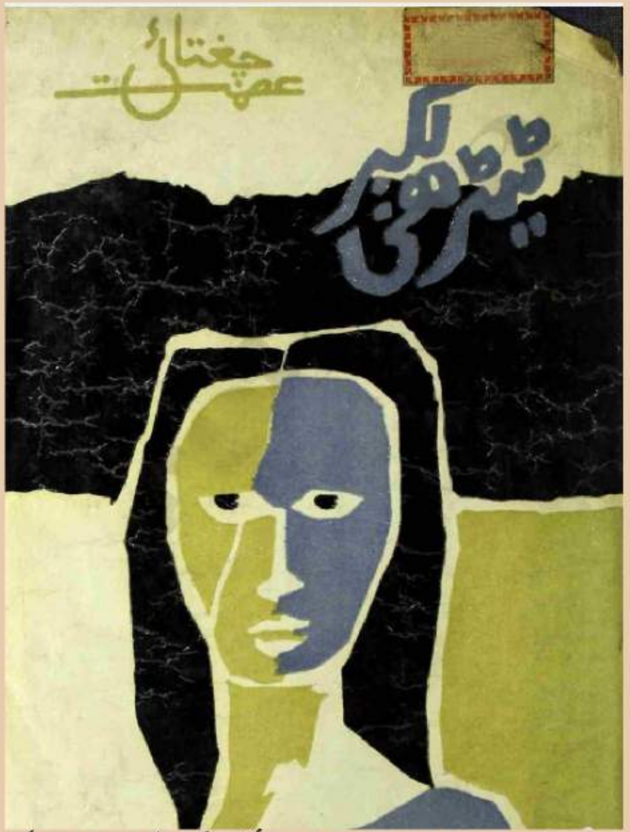

اس مطالعے میں عورت کے جن مسائل کا ذکر کیا گیا ہے کیا آج کی عورت ان مسائل سے دوچار نہیں ہے؟ آج کے اس ترقی یافتہ اور صنعتی دور میں عورت کو کیا وہ مقام حاصل ہو پایا ہے جس کی وہ حقدار ہے؟ جنسی مساوات میں آج کی عورت کیا اس مقام پر ہے جو تانیثیت کا اصل مقصد رہا ہے؟ ان سبھی سوالوں کے جواب ہمیں نفی میں ملیں گے۔ تو ایسے میں ایک بار پھر تانیثی تحریک کا رخ کرنا پڑتا ہے اور ضرورت محسوس ہوتی ہے ایسے ادب کی جو تانیثی ادب ہو، جو عورت کے تئیں بیداری کا جذبہ پیدا کرے۔

□□□

Mohd Amil Badauni
Research Scholar
Dept. of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202002 (U.P)

ڈاکٹر محمد نہال افروز

مہرالنسا پرویز

کی کہانیوں میں نسائی مسائل کی عکاسی

مہرالنسا پرویز کا شمار ہندی کے مشہور و معروف فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کی پیدائش 10 /دسمبر 1944 کو ہوئی۔ان کے والد ''عبدالحمید خان'' ڈپٹی کلکٹر تھے اور والدہ ''شہزادی بیگم'' مغل خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔مہرالنسا پرویز زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہیں، لیکن ان کا مشاہدہ بہت عمیق ہے۔زندگی کے مختلف تجربات نے ان میں ادبی رجحان پیدا کر دیا۔مہرالنسا پرویز اپنی ادھوری تعلیم کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ''مجھے اتنی تعلیم ملی کہ میں اپنا ادب لکھ سکتی ہوں اور اتنی بھی تعلیم نہیں ملی کہ میں اپنی زندگی کے لیے نوکری کر سکتی تھی۔''

(مہرالنسا پرویز، رسالہ رِتُو چکر، مارچ - جون، مہرالنسا پرویز، ص 45)

مہرالنسا پرویز کی ادبی زندگی کا آغاز ان کے بچپن ہی میں ہوتا ہے۔ان کی پہلی کہانی رسالہ ''دھرم یوگ'' میں چھپی، جس کے لیے ان کو ستّر (70) روپئے کا معاوضہ بھی ملا تھا۔ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''آدم اور حوا'' کے عنوان سے 1972 میں شائع ہوا۔اس کے بعد ان کی کہانیوں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے، جن میں ''ٹہنیوں پر دھوپ'' 1977، ''غلط پُرس'' 1978، ''فالگنی'' 1978، ''انتم چڑھائی 1982، ''ایک اور سیلاب'' 1990، ''اَیودھیا سے واپسی'' 1991، ''ڈھہتا کتب مینار'' 1993، ''رشتے'' 1993، ''اماں'' 1997، ''سمر'' 1999، ''لال گلاب'' 2006 اور ''میری بستر کی کہانیاں'' 2006 وغیرہ شامل ہیں۔

مہرالنسا پرویز کی کہانیوں پر بات کرنے سے پہلے خواتین کے بنیادی مسائل کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ہمارے معاشرے بالخصوص ہندوستانی معاشرے میں عورتوں کو مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کہیں پر معصوم لڑکیاں ظلم و زیادتی کا شکار ہوتی ہیں۔تو کہیں پر عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے کی مخالفت کی جاتی ہے۔اس کی وجہ سے عورتیں کبھی کبھی صدائے احتجاج بلند کرنے لگتی ہیں۔

مرد اور عورت معاشرے کو بہتر بنانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔کسی بھی معاشرے کی بقا کے لیے تعلیم اہم ضرورت ہے۔اس لیے ہر مرد و زن کو تعلیم حاصل کرنا بے حد ضروری ہے۔بلکہ عورتوں کی تعلیم پر زیادہ زور دینا ہے چاہیے۔عورتوں کی تعلیم کے لیے یہاں تک کہا گیا ہے کہ ''ایک مرد کی تعلیم ایک فرد کی تعلیم ہے، لیکن ایک عورت کی تعلیم پوری نسل کی تعلیم ہے۔'' اس کے باوجود ہندوستانی معاشرے میں آج بھی بہت سے علاقے ایسے ہیں، جہاں پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ تعلیم پر صرف مرد کا حق ہے اور عورتوں

کی ذمے داری گھر کا کام کاج کرنا ہے۔ ایسے ہی ایک علاقے کی کہانی مہرالنسا پرویز نے ''بھوگے ہوئے دن'' میں بیان کی ہے، جس میں انھوں نے یہ دکھایا ہے کہ کس طرح ایک لڑکے کو تو تعلیم دی جا رہی ہے، لیکن اسی گھر کی سات سالہ بچی کو گھر کے کام کاج میں لگا دیا گیا ہے۔

'مرد اور عورت معاشرے کو بہتر بنانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ کسی بھی معاشرے کی بقا کے لیے تعلیم اہم ضرورت ہے۔ اس لیے ہر مرد و زن کو تعلیم حاصل کرنا بے حد ضروری ہے۔ بلکہ عورتوں کی تعلیم پر زیادہ زور دینا ہے چاہیے۔ عورتوں کی تعلیم کے لیے یہاں تک کہا گیا ہے کہ ''ایک مرد کی تعلیم ایک فرد کی تعلیم ہے'

واقعہ یہ ہے کہ ایک غریب بوڑھے آدمی کی اکلوتی بیٹی جوانی ہی میں بیوہ ہو جاتی ہے۔ اس کے دو بچے ہیں۔ ایک بیٹا جس کا نام 'جاوید' اور بیٹی، جس کا نام 'صوفیہ' ہے۔ بوڑھے ماں باپ اور دونوں بچوں کی دیکھ بھال اور گھر کے اخراجات سبھی کچھ اکیلے ان کی بیٹی ہی کو اٹھانا پڑتا ہے۔ وہ ایک پرائمری اسکول میں ٹیچر ہے۔ گھر کے اخراجات پورے نہ ہونے کے سبب وہ ٹیوشن بھی پڑھاتی ہے۔ اس صورت میں بچوں کو پڑھانا اس کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس نے بیٹے کو تو اسکول میں داخلہ دلا دیا، لیکن بیٹی کو خود ہی گھر میں پڑھانے لگی۔ اس کا ماننا تھا کہ بیٹی کے مقابلے میں بیٹے کو پڑھانا زیادہ ضروری ہے۔ صوفیہ اسکول نہیں جاتی تھی اس لیے گھر کا سارا کام اسے ہی کرنا پڑتا تھا۔ ساتھ ہی وہ لکڑی بیچنے کا بھی کام کرتی تھی۔

ایک دفعہ جب اس بوڑھے شخص کا دوست اس کے گھر آیا اور اتنی کم عمر میں صوفیہ کو لکڑی بیچتے ہوئے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ صوفیہ کے پاس جا کر اس سے پوچھنے لگا:

''کیا نام ہے؟''

''صوفیہ۔''

''بڑا پیارا نام ہے۔ کتنی آمدنی ہوئی؟''

سوفیہ جھینپ کر نیچے دیکھنے لگی۔

''پڑھتی نہیں ہو؟''

''اماں گھر میں پڑھا دیتی ہیں۔''

''اور جاوید؟''

''وہ جاتا ہے، تیسری میں پڑھتا ہے۔''

تبھی سامنے سے دو بچے لکڑی لینے آئے۔ صوفیہ بڑے ہی سدھے ہاتھوں سے ترازو پر لکڑیاں چڑھا رہی تھی۔ مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ سات سال کی لڑکی کو بھی وقت نے کتنا نپڑ (ماہر) بنا دیا ہے۔''

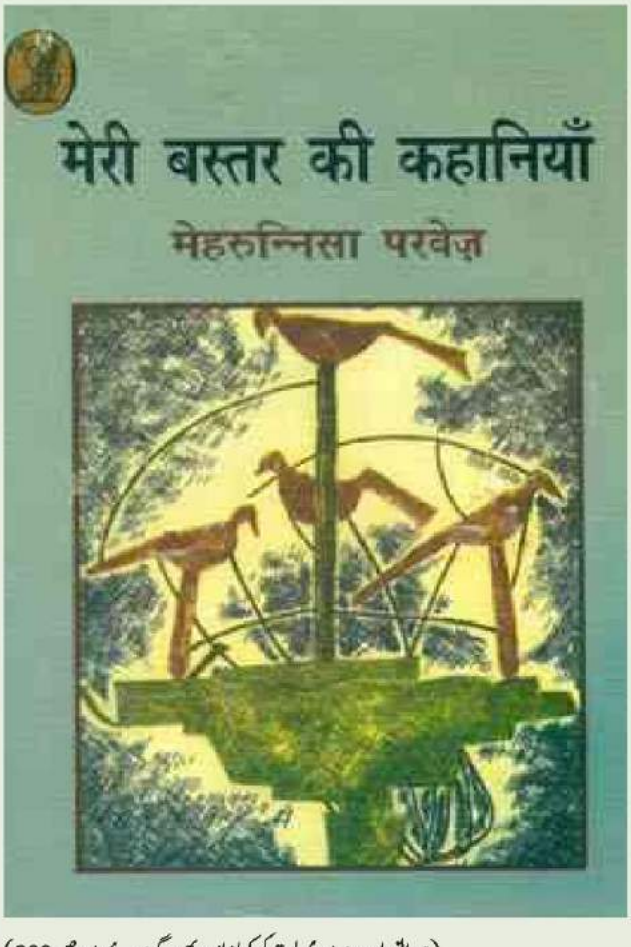

(مہرالنسا پرویز، میری بستر کی کہانیاں، بھوگے ہوئے دن، ص 206)

ایک طرف لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے سے دور رکھا جا رہا ہے تو دوسری طرف لڑکیوں کے پاس تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے انھیں مختلف مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ ان پڑھ لڑکیوں کو نہ تو سماج میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے اور نہ ہی ان کی شادی اچھے خاندان میں ہو پا رہی ہے۔ آج کا ہر لڑکا پڑھی لکھی بیوی چاہتا ہے۔ صرف پڑھی لکھی ہی نہیں چاہتا بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ گھریلو ذمے داری نبھانے کے ساتھ ساتھ معاشی طور پر بھی اس کی مدد کرے۔ اسی مسئلے کو موضوع بنا کر مہرالنسا پرویز نے کہانی ''جانے کب''، لکھی ہے۔

''جانے کب'' ایک ایسے شخص کی کہانی ہے، جس کی جوانی تو بہت مزے سے گزرتی ہے، لیکن بڑھاپے میں اسے بہت سی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ پولیس محکمے میں انسپکٹر تھا۔ اس کے دو بچے ہیں۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ بیٹے کو تو وہ تعلیم دلا دیتا ہے اور بیٹی کو گھر کے کام کاج ہی میں مصروف رکھتا ہے۔ بیٹے کو نوکری مل جاتی ہے۔ اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ دوسری جگہ جا کر رہنے لگتا ہے۔ اس صورت میں بوڑھے آدمی کا کوئی سہارا نہیں رہتا۔ اسے اپنی بیٹی سنو کی شادی کی فکر رہتی ہے، لیکن اس کی شادی نہیں ہو پاتی ہے۔ جب وہ اپنے دوست سے اپنی بیٹی کی شادی کے بارے میں کہتا تو اسے جواب ملتا ہے:

> ''میاں آج کل کے لڑکے پڑھی لکھی لڑکی ڈھونڈتے ہیں۔...... کم سے کم میٹرک تو ہونا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ جانوروں اور لڑکیوں میں، لڑکے کوئی فرق نہیں سمجھتے۔'' پھر منھ کو پاس لا کر دھیمی آواز میں بولے، ''ارے جانو میاں! وہ شیخو کی لڑکی کو دیکھتے ہو، کالا ٹھیکرا رکھی ہے؛ پر ایم اے پاس تھی تو پروفیسر کو پھنسا لیا۔''

(مہرالنسا پرویز، میری بستر کی کہانیاں، جانے کب، ص223)

ایسا نہیں تھا کہ سنو کی کے لیے رشتے نہیں آرہے تھے۔ رشتے تو بہت آتے تھے، لیکن ہر کوئی پڑھائی کے بارے ہی میں پوچھتا تھا۔ ایک بار تو سنو کی بات لگی تھی اور شادی کی پوری تیاریاں بھی ہو گئی تھی، لیکن اچانک ہی شادی ٹوٹ گئی۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''سنو کی بات کہیں بھی نہ لگی ہو، ایسی بات نہیں۔ ایک بار تو 'کانکیر' میں سب طے ہو گیا تھا۔ چاول دال تک چن بن کر کنستر میں رکھ دیے گئے تھے۔ ان دنوں سنو کافی خوش، شرمائی سی لگتی تھی۔ رات کو دیر تک لالٹین پر جھکی ادھورے تکیے کا غلاف پورا کرتی رہتی تھی۔ لڑکے والوں کے یہاں بھی ساری تیاریاں ہو گئی تھیں۔ لال مظہر تک ٹنک گئے تھے کہ اچانک بات چیت ہی میں ٹوٹ گئی تھی۔''

(ایضاً، ص225)

سنو کی عمر بڑھتی جارہی تھی۔ اس بوڑھے شخص کو فکر ہو رہی تھی کہ سنو کے ساتھ کی لڑکیاں دو دو بچوں کی ماں بن گئی ہیں اور ابھی تک سنو کے ہاتھ بھی پیلے نہیں ہوئے ہیں۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے کہ میں نے سنو کو تعلیم نہیں دلائی ہے۔ آخر جانے کب سنو کی شادی ہوگی۔ اسی طرح مہرالنسا پرویز نے ایک ان پڑھ عورت کے کئی مسئلے کو کہانی ''اپنے ہونے کا احساس'' میں بھی بیان کیا ہے۔

ہندوستانی معاشرے میں آج بھی لڑکے کی پیدائش پر خوشیاں منائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس لڑکی کی پیدائش پر گھر کے تمام افراد پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑتا ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال کے لیے مہرالنسا پرویز کی کہانی ''زمانہ بدل گیا ہے'' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''دیکھو، لڑکا ہونے کا فائدہ...... بٹیا کی تو کوئی قدر ہی نہیں، کوئی پوچھتا ہی نہیں، جیسے گھور پر سے اٹھا کر لائے ہوں۔''

(مہرالنسا پرویز، ایودھیا سے واپسی، زمانہ بدل گیا ہے، ص139)

عورتوں کے تمام مسائل میں ایک اہم مسئلہ پسند کی شادی کا بھی ہے۔ ہندوستانی معاشرے میں ایک لڑکے کو تو اپنی پسند کی شادی کرنے کی اجازت ہوتی ہے، لیکن ایک لڑکی اپنی پسند سے شادی نہیں کر سکتی۔ جب لڑکی اپنے گھر میں اپنے من پسند لڑکے سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کرتی ہے تو اسے طرح طرح کی باتیں سننی پڑتی ہے۔ اسے بدتمیز، بے ہودہ اور بے شرم لڑکی تصور کیا جاتا ہے۔ یعنی عورتیں کسی اور سے پیار کرتی ہیں اور گھر والوں کے دباؤ پر انھیں شادی کسی اور سے کرنی پڑتی ہے۔ اسی کو موضوع بنا کر مہرالنسا پریز نے کہانی ''قیامت آگئی ہے'' تخلیق کی ہے۔

''قیامت آ گئی ہے'' میں انھوں نے دو بہنوں کی ماضی کی زندگی کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے یہ بتایا ہے کہ جو کام ماضی میں غلط تصور کیا جاتا تھا وہی کام آج کا فیشن بن گیا ہے۔ اس کہانی میں دو مرکزی کردار ہیں۔ دونوں سگی بہنیں ہیں۔ بڑی بہن کی بیٹی کی شادی میں جب چھوٹی بہن آتی ہے تو اس کی بیٹی کو دیکھ کر اسے اس کی ماں، یعنی اپنی بڑی بہن کی شادی کا وقت یاد آ جاتا ہے۔

اس کی بڑی بہن شادی سے پہلے ایک لڑکے سے محبت کرتی ہے اور حاملہ ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد جب اس کی شادی کے دن قریب آ جاتے ہیں تو وہ گھبراتی ہے اور اس بات کو اپنی چھوٹی بہن نوری کو بتاتی ہے:

''آپا نے میرے ہاتھ کو اپنی چھاتی پر رکھ کر بھینچ لیا اور بولیں۔ ''نوری میں بیمار ہوں۔''

''تمہیں بخار آیا ہے آپا؟''

''نہیں رے، تو تو ایک دم بے وقوفوں سی باتیں کرتی ہے۔ بھلا اس عمر میں بخار کا کیا کام؟ مجھے ادھر دو تین مہینے چڑھ گئے ہیں۔''

(مہرالنسا پرویز، میری بستر کی کہانیاں، قیامت آ گئی ہے، ص135، 136)

یہ سن کر چھوٹی بہن کے ہوش اڑ گئے۔ وہ سمجھ گئی کی آپا جمشید ماموں کی شکار بنی ہے۔ جب کہ وہ کسی اور سے پیار کرتی تھی۔ اس نے کہا یہ عورت پر کیا ظلم ہے۔ پیار کسی سے، ہوس کی شکار ہوئی کسی دوسرے کی اور اب شادی کسی اور سے ہو رہی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''جمشید ماموں پکے شکاری تھے۔ بھلا ہانکے کے باہر ہرنی کو دیکھ سکتی تھی اور آپا جمشید ماموں کے ہوس کی شکار ہو گئی۔ بڑی بڑی شوخ آنکھیں ایک دم نیچے جھک گئیں۔

ادھر اماں آپا کی بات چیت طے کرنے میں لگی تھیں۔ میری چھوٹی سی عقل میں اتنی ڈھیر ساری گڈمڈ باتیں ایک ساتھ نہیں بیٹھ پا رہی تھیں۔ پیار کسی سے، ہوس کی شکار ہوئی کسی دوسرے کی، اب شادی کسی تیسرے سے طے ہو رہی تھی۔''

(ایضاً ص140)

بہر حال کسی طرح شادی ہو گئی۔ وقت گزر گیا۔ اب اس کی بیٹی رنو کی شادی ہو رہی تھی۔ چاروں طرف چہل پہل تھی۔ رنو کو بوڑھی قسم کی عورتوں نے کافی رلا دیا تھا۔ دولہے میاں منہ پر رومال رکھے پریشان ہو رہے تھے۔ شاید وہ بھی رنو کی حالت سے پریشان تھے۔ دلہن کی وداعی ہونے والی تھی کہ اچانک رنو نے اپنی خالہ سے کہا کہ مجھے باتھ روم جانا ہے۔ باتھ روم لے جانے پر رنو کو الٹی آئی۔ پتہ چلا کہ وہ حاملہ ہے۔ رنو کی خالہ یہ جان کر پریشان ہو گئی۔ جب یہ بات اس کی ماں کو پتا چلی تو اس نے کہا اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے دونوں ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں۔ اب یہ ہمارا زمانہ تو رہا نہیں کہ جب ہمیں چھپا کر زہر کھانا پڑا تھا۔ یہ نیا زمانہ ہے۔

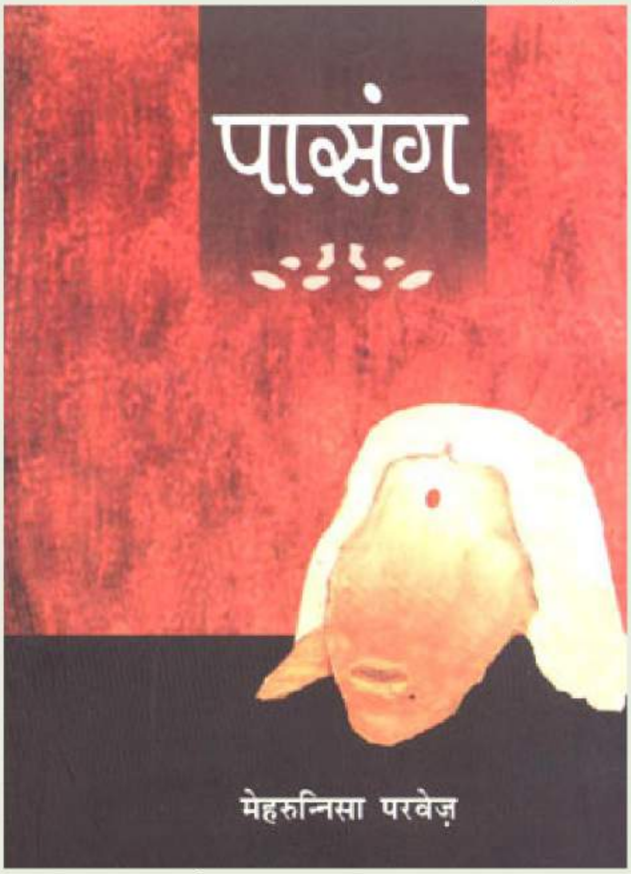

عصر حاضر میں ایک بڑا مسئلہ اجنبیت اور اکیلے پن کا ہے۔ انسان سماج میں رہتے ہوئے بھی اکیلے رہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ پہلے تو یہ مسئلہ شہروں اور قصبوں ہی میں دیکھنے کو ملتا تھا، لیکن اب یہ مسئلہ گاؤں میں بھی دیکھنے کو ملنے لگا ہے۔ مرد کے مقابلے ایک عورت کو اکیلے رہنا بہت ہی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ''ننگی ٹہنی'' میں ایک ایسی ہی عورت کی کہانی کو موضوع بنایا گیا ہے، جو اپنے ہی گھر میں اکیلے رہنے پر مجبور ہے۔

کہانی ''ننگی ٹہنی'' میں زیتون کی ماں اپنے ہی گھر میں اکیلی رہنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے شوہر اور بچوں کے پیار کے لیے ترستی ہے۔ زیتون کے والد نے کئی شادیاں کی تھیں۔ وہ اپنی دوسری بیویوں کو پیار کرتے تھے، لیکن زیتون کی ماں کو صرف گھریلوں کام میں لگائے رکھتے تھے۔ اس کے دونوں بچے دادی اور پھوپھی کے پاس رہتے تھے۔ اپنے بچوں سے دور رہنے کی وجہ سے وہ ہمیشہ پریشان رہتی تھی۔ اسے اپنے بچوں

کی بہت فکر ہوتی تھی۔ وہ اپنے بچوں کی جدائی سہہ نہیں پاتی۔ اس وجہ سے اسے ہمیشہ ٹینشن رہتی تھی۔ اسی ٹینشن میں وہ فالج کا شکار ہو جاتی ہے۔ فالج کی وجہ سے وہ اکیلے پن کے ساتھ ساتھ لاچار بھی ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں اس کی خدمت کرنے کی بجائے اس کی چار پائی گھر کے ایک کونے میں رکھ دی جاتی ہے۔ پہلے ہی لوگ اس سے نفرت کرتے تھے۔ فالج کی وجہ سے اس کی طرف کوئی دیکھتا بھی نہیں تھا اور وہ اکیلے پن میں چاروں طرف ٹکر ٹکر دیکھتی رہتی تھی۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''اس کی چار پائی پیچھے کی چھپر میں لگا دی گئی۔ وہ بستر پر پڑے پڑے ٹکر ٹکر آنکھیں گھما گھما کر گھر کی ساری حرکتوں کو دیکھتی رہتی۔

پہلے ہی لوگ اس پر لعنتیں بھیجتے تھے، اب تو اس کی چار پائی کی طرف کوئی بھولے سے بھی نہیں بھٹکتا۔ وہ نام لے لے کر بچوں کو پکارتی، اپنے پاس بلاتی، لیکن بچوں کو اس کے پاس آنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ وہ کھیل میں، پڑھائی میں یا دادی سے کہانی سننے میں لگے رہتے تھے۔

گھر کے کام کے لیے اور کھانا بنانے کے لیے ایک جوان بیوہ عورت کو رکھ لیا گیا تھا، لیکن کیا وہ سچ میں نوکرانی تھی؟ وہ اس کی سوت تھی۔'' (مہرالنسا پرویز، ننگی ٹہنی، ص142)

کہانی ''شناخت'' میں بہت ہی گھناونے مسئلے کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کہانی میں یہ دکھایا گیا ہے کہ 'بتی' کی ماں اپنی بیٹی کے ساتھ رہتی تھی اور انڈے بیچ کر اپنا گزارا کرتی ہے۔ بتی کا باپ بتی کی پیدائش کے پہلے ہی کسی دوسری عورت کے ساتھ بھاگ گیا تھا، لیکن گاہے گاہے وہ بتی کی ماں 'شاردا' کے پاس آتا جاتا ہے۔ بتی اسے کبھی دکھی نہیں تھی۔ وہ جب بھی آتا سیدھے کوٹھری میں جاتا اور بتی کی ماں کے ساتھ کچھ دیر رہتا اور چلا جاتا تھا۔ اس کے آنے سے بتی کی ماں خوش ہوتی تھی، کیوں کہ وہ جب بھی آتا تھا تو صرف شاردا کے ساتھ وقت ہی نہیں گزارتا تھا بلکہ اسے کچھ روپے بھی دے کر جاتا تھا۔ اس بار بتی کا باپ بہت دنوں کے بعد آیا تھا۔ بتی کو دیکھ کر اس نے شاردا سے بتی کے بارے میں پوچھا۔ شاردا نے بتایا بتی ہے اپنی بیٹی۔ بتی اس وقت بچپن کو چھوڑ کر جوانی میں قدم رکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اس کے باپ کی نیت خراب ہوگئی۔ اس نے کہا شاردا آج رات میں یہیں رہوں گا۔ یہ سن کر شاردا بہت خوش ہوئی۔ وہ یہاں جب بھی آتا تھا بھورے رنگ کا چیک دار کوٹ ہی پہن کر آتا تھا۔

رات کو شاردا اور بتی کا باپ اندر والی کوٹھری میں سونے کے لیے گئے اور بتی سارا کام ختم کر کے باہر کی کوٹھری میں سوگئی۔ رات میں جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے لگا ماں اس کے پاس سوئی ہوئی ہے، لیکن جب اسے شراب کی بدبو آئی تو اسے لگا ماں بھی شراب پینے لگی۔ تبھی کوٹھری کا دروازہ کھلا اور لالٹین کی روشنی پڑنے سے اس کی غلط فہمی دور ہوئی۔ وہ اس کی ماں نہیں بلکہ اس کا باپ تھا، جو اسے اپنی ہوس کا شکار بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی یہ حرکت دیکھ کر بتی کی ماں آگ بگولہ ہوگئی۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''نیچ، پاپی کتے اٹھ۔'' ماں نے غصے سے چھنچھناتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا۔

بتی گھبرائی سی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ڈر کے مارے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

''نکل، نکل، میرے گھر سے۔ پھر کبھی اپنی منحوس صورت مت دکھانا۔'' ماں نے اندھیرے میں اسے باہر نکال دیا۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا سڑک پر گر گیا۔ سڑک پر پڑے پڑے ہی وہ ماں کو گالیاں بکتا رہا۔ ماں نے دروازہ لگا دیا، کبھی نہ کھولنے کے لیے۔ بند دروازے کے پاس سے اس کی گندی گالیوں کے لفظ سنائی دیتے رہے۔

بتی کو تعجب ہوا۔ ماں نے اسے کچھ نہیں کہا اور چپ چاپ لیٹ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا، ماں سو رہی ہے یا رو رہی ہے۔'' (مہرالنسا پرویز، آدم اور حوا، شناخت، 28)

اس واقعے کے دو مہینے بعد وہ پھر آیا، لیکن بتی کی ماں نے دروازہ نہیں کھولا۔ اس نے بہت منتیں کیں پھر گالیاں بھی دیں۔ اس کے بعد بھی اس نے دروازہ نہیں کھولا۔ اس کے باپ نے محلے والوں کو جمع کر کے شاردا پر بہت سے الزام لگائے اور وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے دو چار دن بعد پولیس آئی اور بتی کی ماں سے پوچھنے لگی تیرا شوہر کہاں ہے۔ اس نے جواب میں کہا میرا کوئی شوہر نہیں ہے۔ پولیس اسے تھانے لے گئی۔ شاردا نے لاش کو دیکھنے کے بعد بھی اس کی شناخت کرنے سے انکار کر دیا اور گھر واپس آگئی۔ کچھ دن بعد بتی اپنا گھر صاف کر رہی تھی۔ صفائی میں کپڑوں کے ٹکڑوں سے بنا ایک گدا ملا، جسے دیکھ کر بتی کی ماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور بتی سے بولی میں نے اسے پہچان لیا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''بتی کے ہاتھ سے گدّے کو لے کر دیر تک دیکھتی رہی۔ بتی نے ماں کی آنکھوں میں ٹھیک وہی پرچھائی دیکھی، جو لاش کو دیکھتے وقت اس کی آنکھوں میں تھی۔

اچانک ماں کی آنکھیں بھر گئیں اور وہ رونے لگی۔ گڈا اس کے ہاتھ سے گر کر زمین پر پڑا تھا۔

ماں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس کے سامنے وہی پرانی چندیوں کا بنا بھورے چیک کی اچکن پہنے گڈا پڑا تھا۔ ماں کہہ رہی تھی، ''بتی، میں نے اسے پہچان لیا۔ دیکھ یہ...... یہ پڑی ہے اس کی لاش۔'' (ایضاً، ص30)

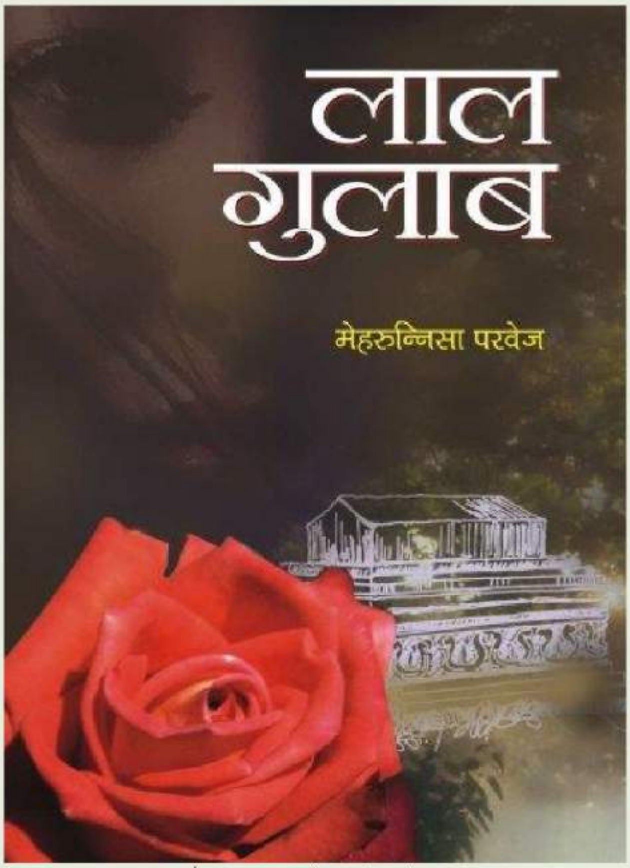

شاردا اپنے شوہر کی حرکتوں کی وجہ سے پولیس تھانے میں اسے پہچاننے سے انکار کر دیتی ہے، لیکن جب گھر میں بھورے چیک کے کوٹ کی چندیوں سے بنے گڈے کو دیکھتی ہے تو وہ اپنے آپ کو روک نہیں پاتی۔ اس کا شوہر ہمیشہ بھورے چیک کا ہی کوٹ پہنتا تھا۔ اس وقت اسے اپنا شوہر بے اختیار یاد آتا ہے۔ بھلے ہی وہ شرابی اور کام چور تھا۔ اس کی بیٹی کو غلط نگاہ سے دیکھتا تھا، لیکن تھا تو اس کا شوہر ہی۔ اس طرح اس کہانی میں ایک عورت کے مختلف درد کو بیان کیا گیا ہے۔

مہرالنسا پرویز نے جنسی مسائل پر بھی متعدد کہانیاں لکھی ہیں۔ کہانی ''دہری کی خاطر'' میں طوائف کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کہانی کا کردار رکشہ چلاتا ہے اور اس سے اتنا ہی پیسہ کماتا ہے، جس سے وہ شراب پی سکے۔ اگر شراب پینے کے بعد کچھ پیسہ بچ جاتا تھا تو اسے جوئے میں ہار جاتا تھا۔ گھر کا خرچ اس کی بیوی پورا کرتی تھی۔ اس کی بیوی اپنی دو بیٹوں کو لے کر کسی طرح گھر کا خرچ اٹھاتی تھی۔ جب رات میں وہ گھر آتا تھا تو اس کی بیوی اسے کھانا نہیں دیتی۔ اس پر وہ کہتا آج کھانا دے دو، کل سے شراب نہیں پیوں گا اور محنت سے پیسہ کماؤں گا، لیکن صبح ہوتے ہی وہ اپنا وعدہ بھول جاتا اور پھر شراب پیتا۔ ایک مرتبہ اس کی بیوی بیمار پڑ جاتی ہے۔ علاج نہ ہونے کی وجہ سے وہ مر جاتی ہے۔ بیوی کے انتقال کے بعد وہ دوسری شادی کرتا ہے۔ دوسری بیوی عمر میں اس سے کافی چھوٹی ہے۔ دوسری شادی کے بعد بھی وہ نہیں سدھرتا۔ اس کا کام وہی شراب پینا اور جوا کھیلنا رہتا ہے۔ ایسے میں اس کی نئی بیوی اپنی گھریلوں اور جسمانی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے صاحب لوگوں کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے۔ جب وہ ادھیڑ عمر کی ہو جاتی ہے تو اپنی جگہ اپنے سوتیلی بیٹی کو اس کام میں لگا دیتی ہے اور وہ خوب پیسہ کماتی ہے۔ بڑی بہن کو پیسہ کماتا دیکھ کر چھوٹی بہن بھی پیسہ کمانے کے لالچ میں پڑ جاتی ہے۔ کہانی کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''آخر باہر کمانا بھی پڑتا ہے۔ تو تھوڑا بڑی ہو جا، پھر جانا کام پر، تیرے لیے بھی ایک ڈبا پاؤڈر لا دونگی۔'' اس نے اسے دلاسہ دیا۔

''اے دیدی، اب تو بہت سندر دکھتی ہے۔ خوب بڑی لگتی ہے۔'' سرجنی نے اسے لپٹاتے ہوئے کہا۔

''سچی۔''............

''ہاں، وہ پٹواری کا کا کل گلی میں نانی اماں سے بول رہا تھا۔''

''اچھا۔''

''ہاں دیدی، اب تو تیرے پاس پیسہ بھی خوب رہتا ہے۔ تو چھپا چھپا کر رکھتی ہے نا۔ میرے لیے بھی ایک ٹیلرنگ کی ساڑی لا دے نا۔''

''اچھا لا دونگی۔'' اس نے گہری سانس کھینچی۔ ''تو بڑی ہو گی نا، تو میرے سے زیادہ پیسہ کمائے گی۔''

''اچھا، پیسہ کیسے ملتا ہے اتنا؟''

''بڑا جوکھم کا کام ہے، سسری دیہہ ایک بار میں ٹوٹ کر چٹک جاتی ہے۔ بابو لوگوں کی چکاری کرنی پڑتی ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''اب تو سوجا، بات تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ جب بڑی ہو جائے گی تو اپنے آپ سمجھ جائے گی۔''

(مہرالنسا پرویز، میری بستر کی کہانیاں، دہری کی خاطر، ص112)

بڑی بہن لوگوں کو خوش کرتے کرتے ایک ماسٹر سے پیار کرنے لگتی ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اس کے پیار میں پاگل ہو جاتی ہے۔ اب وہ لوگوں کے پاس نہیں جاتی ہے۔ ہر وقت اسی ماسٹر سے ملنے کے فراق میں رہتی ہے۔ جب یہ بات اس کی سوتیلی ماں کو پتہ چلتی ہے تو وہ اسے بلا کر سمجھاتی ہے کہ مرد کبھی ایسی عورت سے پیار نہیں کرتا۔ ایسی عورتوں کو مرد ہمیشہ کھیلنے ہی کی چیز سمجھتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''مرد کی ذات اور روپو کی ذات ایک ہوتی ہے۔ کھڑی فصل کتر کر اڑ جاتا ہے۔ بس مرد سے کھیلتی رہے گی تو خوش رہے گی، جہاں پیار کرنے لگے گی وہیں بیکار ہو جائے گی۔ بابو دیہہ کا بھوکا ہوتا ہے من کا نہیں۔'' (ایضاً،ص113)

'مہر النسا پرویز نے اپنی بیشتر کہانیوں میں عورتوں کے مسائل ہی کو موضوع بنایا ہے۔ تمام ترقی اور آزادی کے باوجود آج بھی ہمارے سماج کی بہت سی عورتیں مختلف مسائل سے لڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مہر النسا پرویز ایک حساس اور ذہین فن کار ہیں۔ وہ ان تمام مسائل پر گہری نظر رکھتی ہیں اور ان کو اپنی کہانیوں کے ذریعے اپنے قاری تک پہنچاتی ہیں۔ مہر النسا پرویز خود ایک عورت ہونے کی وجہ سے عورتوں کی حسیت کو اچھی طرح سے محسوس کرتی ہیں اور ان کے مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بناتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں قارئین کے ذہن کو جھنجھوڑتی ہیں اور وہ عورتوں کے مسائل پر غور کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہی مہر النسا پرویز کی کامیاب کہانی کار ہونے کی دلیل ہے۔'

سوتیلی ماں کے سمجھانے کے باوجود اس ماسٹر سے اس کے پیار کا بھوت نہیں اترتا۔ چوری چوری وہ اس ماسٹر سے ملتی رہتی ہے۔ آخر کار وہ حاملہ ہو جاتی۔ جب وہ حاملہ ہو جاتی ہے تو ماسٹر بغیر اس کو بتائے کہیں بھاگ جاتا ہے۔ اس کے حاملہ ہونے کی بات گھر میں پتہ چلتی ہے تو اسے گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔ وہ گاؤں میں اِدھر اُدھر بھٹکتی رہتی ہے۔ پھر اسے گاؤں ہی کا ایک آدمی اپنے گھر میں پناہ دیتا ہے۔ موقع پا کر وہ بھی اسے اپنی ہوس کا شکار بنانا چاہتا ہے، لیکن اس آدمی کی بیوی کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ اقتباس دیکھئے:

> ''ارے، تری دیہہ میں آگ لگے، تجھے مرنا بھی تھا تو میرے ہاتھوں۔'' کاکی ٹنگیا پھینک کر زمین پر بیٹھ کر رونے لگی۔ ''میں کئی دنوں سے ٹوہ لے رہی تھی۔ بھلا عورت کی آنکھ کے نیچے آدمی کے کرم چھپتے ہیں! جسے لڑکی سمجھ کر رکھا اسی کے ساتھ پاپ کرنا چاہتا تھا۔'' (ایضاً،ص124)

ان کہانیوں کے علاوہ مہر النسا پرویز نے ''کانی بانٹ''، ''صرف ایک آدمی''، ''خالی آنکھوں کا پیڑا''، ''نیا گھر''، ''جاگر''، ''بند کمروں کی سسکیاں''، ''خاموشی کی آواز''، ''غلط پُرس''، ''رشتے''، ''بوند کا حق''، ''اپنے ہونے کا احساس''، ''کیوں نہیں''، ''پانچویں قبر''، ''ایودھیا سے واپسی''، ''سیڑھیوں کا ٹھیکا''، ''پتھر والی گلی''، ''آتنک بھرا سکھ''، ''فالگنی''، ''پاپا کا گھر''، ''سونے کا بیسر''، ''آکاش نیل''، ''آرزو کے پھول''، ''بنجر دوپہر''، ''بتیا ایک دوپہر کی''، ''جیون منتھ''، ''ویرانے'' وغیرہ کہانیوں میں بھی عورتوں کے مختلف مسائل کو موضوع بنایا ہے۔

المختصر یہ کہ مہر النسا پرویز نے اپنی بیشتر کہانیوں میں عورتوں کے مسائل ہی کو موضوع بنایا ہے۔ تمام ترقی اور آزادی کے باوجود آج بھی ہمارے سماج کی بہت سی عورتیں مختلف مسائل سے لڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مہر النسا پرویز ایک حساس اور ذہین فن کار ہیں۔ وہ ان تمام مسائل پر گہری نظر رکھتی ہیں اور ان کو اپنی کہانیوں کے ذریعے اپنے قاری تک پہنچاتی ہیں۔ مہر النسا پرویز خود ایک عورت ہونے کی وجہ سے عورتوں کی حسیت کو اچھی طرح سے محسوس کرتی ہیں اور ان کے مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بناتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں قارئین کے ذہن کو جھنجھوڑتی ہیں اور وہ عورتوں کے مسائل پر غور کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ یہی مہر النسا پرویز کی کامیاب کہانی کار ہونے کی دلیل ہے۔

□□□

Dr. Md Nehal Afroz
Department of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 500032 (T.S)

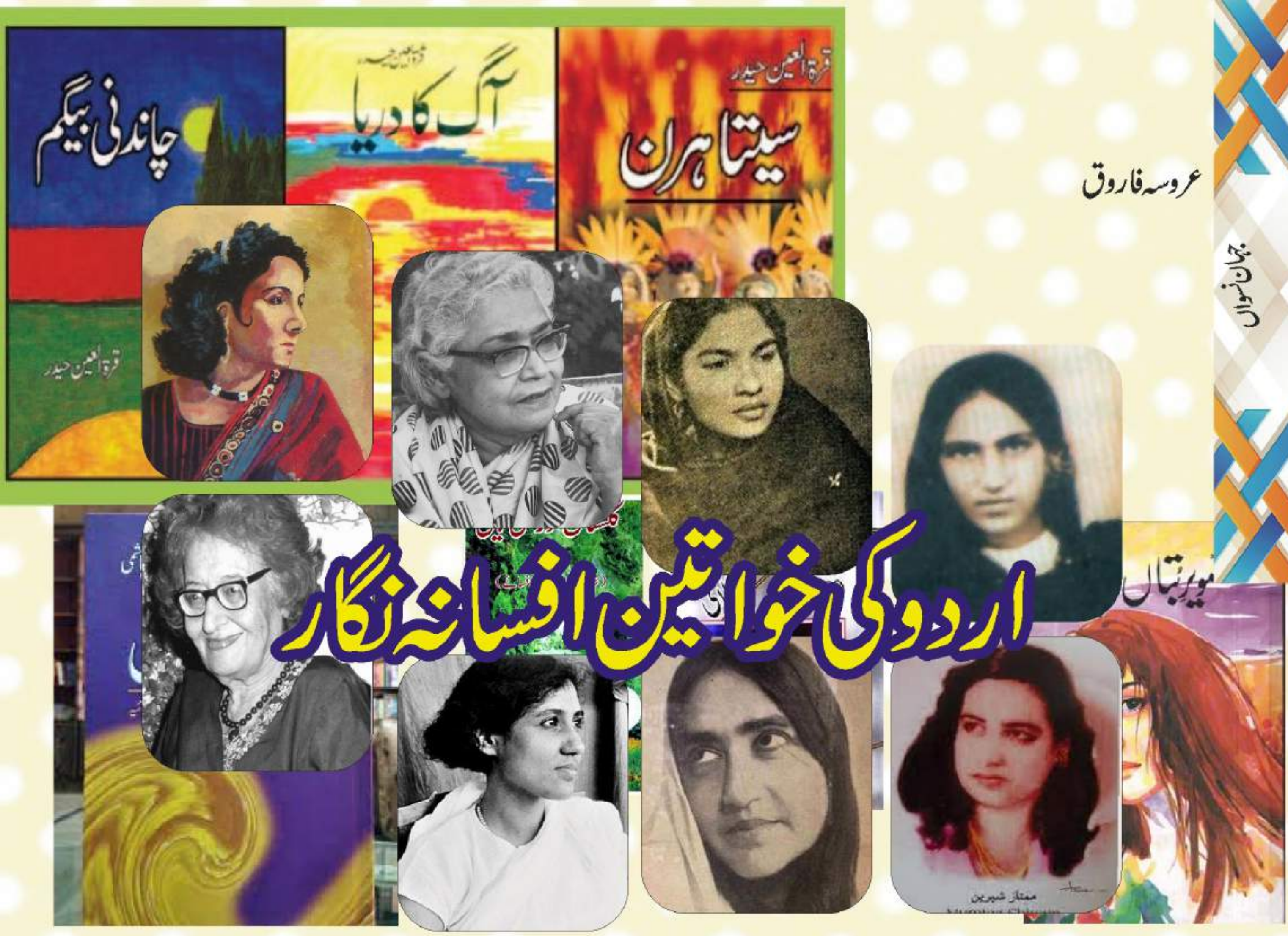

اردو کی خواتین افسانہ نگار

عروسہ فاروق

افسانہ عہد حاضر کی مقبول ترین صنف ہے، جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ صنف اختصار کے ساتھ زندگی کی مجموعی حقیقت کو قریب سے دیکھنے کا کام کرتی ہے۔ افسانہ ایک ایسا بناوٹی سچ ہے جس سے سماج کا حسن و قبح بے دریغانہ سامنے آتا ہے۔ حقیقی زندگی چونکہ لاتعداد ابعاد سے تعبیر ہے اس لیے افسانہ میں موضوعاتی تکثیریت کا پایا جانا ایک فطری امر ہے۔ اسی لیے انسانی زندگی سے جڑا ہر واقعہ افسانے کا موضوع بن سکتا ہے، البتہ اختصار کا پہلو اس کے تاثر کی ضمانت ہے۔

اردو افسانے کے بنیاد گزاروں میں سب سے اہم نام منشی پریم چند کا ہے۔ محققین نے انھیں اردو افسانے کا امام کہا ہے۔ اگر چہ اردو افسانے کی ابتدا پریم چند سے پہلے ہو چکی تھی، علامہ راشد الخیری، عبدالحلیم شرر، سجاد حیدر یلدرم وغیرہ نے پریم چند سے چند سال قبل افسانہ نگاری کی شروعات کی تھی لیکن کیفیت و کمیت کے اعتبار سے پریم چند ہی کا پلڑا بھاری نظر آتا ہے۔ پریم چند کو حقیقت پسندی Realism کا بنیاد گزار بھی قرار دیا جاتا ہے۔ جہاں ایک طرف حقیقت نگاری پریم چند کے قلم سے صفحۂ قرطاس پر آکر قارئین کے دلوں پر ایک سنجیدہ تاثر قائم کر رہی تھی وہیں دوسری طرف رومانیت Romanticism کے شیدائی (جس کی داغ بیل اردو افسانے میں سجاد حیدر یلدرم نے ڈالی) داخلی واردات کے بیان کے تناظر میں اردو افسانے کے پیچ و خم سنوارنے میں مصروف تھے۔ اس طرح اردو افسانے کے افق پر دو نظریے "پریم چند اسکول" اور "یلدرم اسکول" ایک ساتھ طلوع ہو کر متوازی سطحوں پر اپنی اپنی اہمیت منوانے میں کامیاب ہوئے۔ پریم چند اسکول کے تابعین جہاں سماجی حقیقت کو صفحۂ قرطاس پر لاتے رہے، وہیں یلدرم اسکول نے رومانیت کے موضوعات سے اردو افسانے کو ایک نئی فکری اور فنی جہت عطا کی۔

اردو افسانے کی عمارت کو قائم و مستحکم کرنے میں مرد فنکاروں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا بھی برابر کا حصہ ہے۔ اردو کی پہلی خاتون افسانہ نگار کون ہے؟ اس سلسلے میں محققین کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ زیادہ محققین اس بات پر متفق ہیں کہ اردو کی پہلی خاتون افسانہ نگار "صغرا ہمایوں مرزا" ہے۔ صغرا صاحبہ کی ہم عصر خواتین افسانہ نگاروں میں محمدی بیگم، سیدۃ النساء، عباسی بیگم، طاہرہ دیوی شہزادی وغیرہ کا نام بھی شامل ہے۔ صغرا صاحبہ نے اپنے افسانوں میں عورتوں خاص کر مسلمان عورتوں کے مخصوص مسائل کی آئینہ داری کی ہے۔ ان کے افسانے اگرچہ فنی معیار پر پورا نہیں اترتے لیکن انھوں نے موضوعات کا حق ادا کیا ہے۔ فنی سطح پر

جس اردو خاتون افسانہ نگار کے یہاں ہمیں پہلی مرتبہ تکمیل کا احساس ہوتا ہے وہ قرۃ العین حیدر کی والدہ نذر سجاد حیدر ہے۔ان کے افسانے فنی نقطہ نظر سے افسانے کی شعریات پر کھرا اترتے ہیں۔نذر سجاد حیدر ایک روشن خیال افسانہ نگار تھیں۔عورتوں کی تعلیم ان کے سامنے اتنی ضروری تھی جتنا کہ زندگی کے لیے سانس۔ایک جگہ لکھتی ہیں:

''عورت تعلیم یافتہ ہو تو آسانی کے ساتھ راہ کے کانٹوں کو صاف کر کے زندگی کے سفر کو پرسکون بنا سکتی ہے''[2]

(بحوالہ: خورشید زہرہ عابدی، ترقی پسند افسانے میں عورت کا تصور، اردو گھر انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، 1987، ص 45)

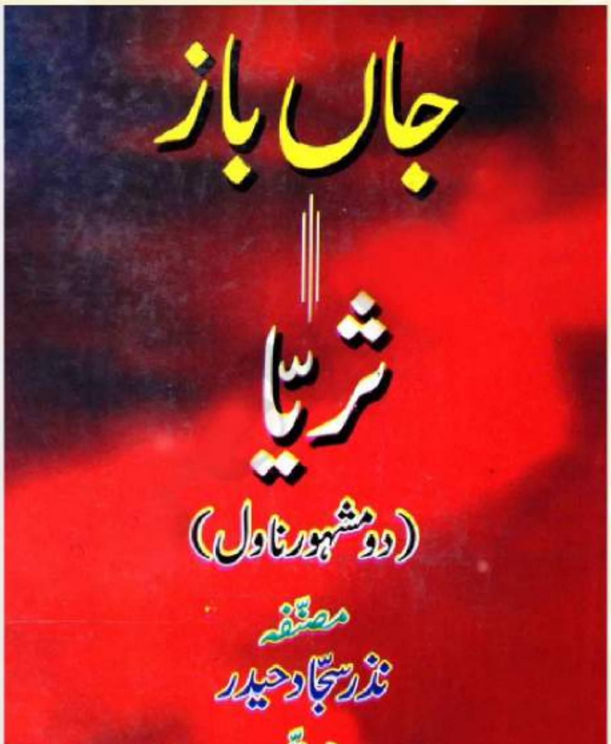

انھوں نے حقیقت سے رومانیت کا طویل سفر طے کیا۔ان کا پہلا افسانہ ''خون ارماں'' 1915 میں شائع ہوا۔اس کے بعد ان کے دیگر افسانے جن میں نیرنگِ زمانہ، حق بہ حقدار مقبول ہوئے۔ان کے دیگر افسانوں میں مانوس تمنا، شہید وفا، اختر وزہرا وغیرہ شامل ہیں۔ان افسانوں کا بنیادی موضوع عشق ہے۔ان کا ایک مشہور افسانہ ''جان بار'' ہے جسے حکیم احمد شجاع نے تعریف کے ساتھ ''ہزار داستان'' رسالہ میں شائع کیا تھا۔ان کے یہاں سادہ اور عام فہم ڈکشن دیکھنے کو ملتا ہے۔جملوں میں سلاست اور روانی کی وجہ سے ان کے افسانے اپنے زمانے میں بے حد مقبول ہوئے۔عورتوں کی زبان خاص کر عورتوں کے محاورات کو افسانوں میں استعمال کرنے میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔

اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں انگارے سے قبل رومانی افسانہ نگاروں کی فہرست میں ایک اہم نام حجاب امتیاز علی کا ہے۔ان کی والدہ عباسی بیگم بھی اپنے دور کی ممتاز افسانہ نگاروں میں شامل تھیں۔حجاب امتیاز کے افسانوں کا تانا بانا رومانیت سے شروع ہو کر رومانیت پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔حجاب نہ صرف افسانہ نگار تھیں بلکہ انھوں نے ایک ناول نگار، ڈراما نگار اور مضمون نگار کی حیثیت سے بھی اردو ادب میں جگہ بنائی ہے۔انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز کم سنی میں ہی کیا تھا۔ان کا پہلا افسانہ ''میری ناتمام محبت'' کے نام سے منظر عام پر آیا، جس وقت ان کی عمر صرف 11 سال تھی۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''میری ناتمام محبت'' کے نام سے ہی 1932 میں شائع ہوا۔اسی مجموعے کی بدولت انھیں اردو افسانوی دنیا میں ایک منفرد پہچان ملی۔خورشید زہرا عابدی اس مجموعے میں شامل افسانہ ''میری ناتمام محبت'' کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

''میری ناتمام محبت ایک نابالغ ذہن، ناتجربہ کار لڑکی کی لکھی ہوئی ایسی کہانی ہے جس کی ساخت میں کئی جگہ خود بت تراشی، نوعمری اور جذبات کی ولولہ انگیز ناہمواری جھلکتی ہے یا یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اس بت کی آنکھیں بہت زیادہ نشیلی ہیں اور ابرو بے حد خمدار ہو گئے ہیں۔''

(ایضاً، ص 56)

افسانہ ''صنوبر کے سائے'' ان کا ایک خوبصورت افسانہ ہے جس میں انھوں نے رومانیت کے ذریعے اس وقت کے لوگوں میں پائی جانے والی توہم پرستی supersititions کو خوبصورت انداز میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس افسانے میں راوی اپنی سہیلی کے ساتھ ''نہر روحناک'' کی سیر کو جاتی ہے، جہاں ان کی ملاقات ایک سو سال کے بوڑھے ملاّ سے ہوتی ہے جو نہر روحناک میں ستر سال سے کشتی چلا رہا تھا جب دونوں سہلیاں سیر کو نکلتی ہیں تو راوی جس کا نام 'روحی' ہے وہ اس سو سال کے بوڑھے سے سوال پوچھتی ہے، یوں ذیل کا مکالمہ وجود میں آتا ہے:

''تمھارا مکان کہاں ہے؟''

''مکان کہیں نہیں خاتون۔۔۔''صنوبر کے ان سایوں تلے پڑا رہتا ہوں۔۔۔''

''مجھے محسوس ہوا۔یہ کہتے ہوئے اس کے ضعیف سینے نے ایک آہ بھری ہے۔

''صنوبر کے سائیوں تلے''

میں نے حیران ہو کر کہا۔

''بے پناہ گرمی اور لرزا دینے والی سردی، تمھیں زندگی سے بے زار نہیں کرتی۔اس کا تمہارے پاس کیا علاج ہے؟''

''علاج''؟

اس نے ایک پھیکی ہنسی کے ساتھ کہا: ''میرے پاس پرانی یادیں ہیں۔جس کے پاس کوئی یاد ہو، اس پر کسی موسم کا اثر نہیں ہوتا'' میری دلچسپی یکلخت بڑھ گئی۔''تمہارا ماضی تو افسانوں سے لبریز معلوم ہوتا ہے''

(افسانہ''صنوبر کا سایہ'')

اس افسانے میں حجاب نے رومانیت کے عناصر کا بھرپور طریقے سے استعمال کیا ہے۔انھوں نے فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال کر کے جہاں ایک طرف بوڑھے کے ماضی کی کرب ناکی کو بیان کیا ہے وہیں دوسری طرف اس کی محبت بھری زندگی کی داستان پر اثر اُسلوب میں پیش کی ہے۔اس افسانے میں افسانہ نگار نے بوڑھے کی داستان کو اسی کی زبانی سنا کر کہانی کو اور بھی دلچسپ اور پر تاثیر بنایا ہے۔ستر سال قبل اس کی زندگی خوبصورت اور رنگ برنگی تھی۔اس وقت اس نے صنوبر کے سائے تلے ایک کم سن لڑکی کو دیکھ کر اپنا دل دیا تھا۔محبت سے لطف اندوز ہو کر ان کی شادی ہو جاتی ہے، شادی کے کچھ مہینے بہت سنہرے گزرتے ہیں لیکن اس وقت کے لوگ توہم پرستی کے مرض میں گرفتار تھے۔بوڑھے کے یہاں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ایک روز اس کی بیوی نے اس سے کہا تھا کہ میں نے ہولناک خواب دیکھا کہ تقدیر کا فرشتہ پہاڑوں کی بلندیوں پر اپنے پر ہلا ہلا کر اس سے کہہ رہا تھا کہ اگر تم نے رات تک اپنے بالوں میں ایک کاسنی رنگ کا گلاب نہ سنوارا تو تمھارا گھر اجڑ جائے گا۔

توہم پرستی کا شکار مانجی بیوی کا خواب سن کر سہم گیا اور اس نے طرح طرح کی دشواریاں اُٹھا کر بیوی کو کاسنی رنگ کا گلاب لا کر دیا۔اسی شام جب وہ گھر لوٹ رہا تھا تو اس کی ملاقات حمری نام کے ایک دوست سے ہوئی۔بوڑھے نے اس کے عبا کے کاج پر کاسنی گلاب دیکھ کر حیرانگی سے پوچھا:

''حمری یہ کاسنی گلاب تمھیں کہاں سے ملا''؟

حمری نے جواب میں کہا میری محبوبہ نے مجھے تحفے میں دیا ہے۔

اس طرح مانجی غلط فہمی کا شکار ہو گیا اور اس نے غصے میں اپنی بیوی کو قتل کر کے اسے صنوبر کے سائے تلے دفنا دیا۔واپسی پر مانجی کی ملاقات حمری سے پھر ہوتی ہے اور وہ اسے مطلع کرتا ہے کہ اب تمھاری محبوبہ نہیں رہی۔حمری غصے میں چلا کر کہتا ہے:

''کوتاہ اندیش اور جلد باز! تو بد بخت ہے! وہ گلاب تو میں نے سڑک پر سے اُٹھایا تھا۔میں بازار میں سے گزر رہا تھا کہ گلاب کا پھول دیکھ کر اُٹھا لیا۔شاید تمہارے ہی دریچے سے گرا پڑا ہو۔''

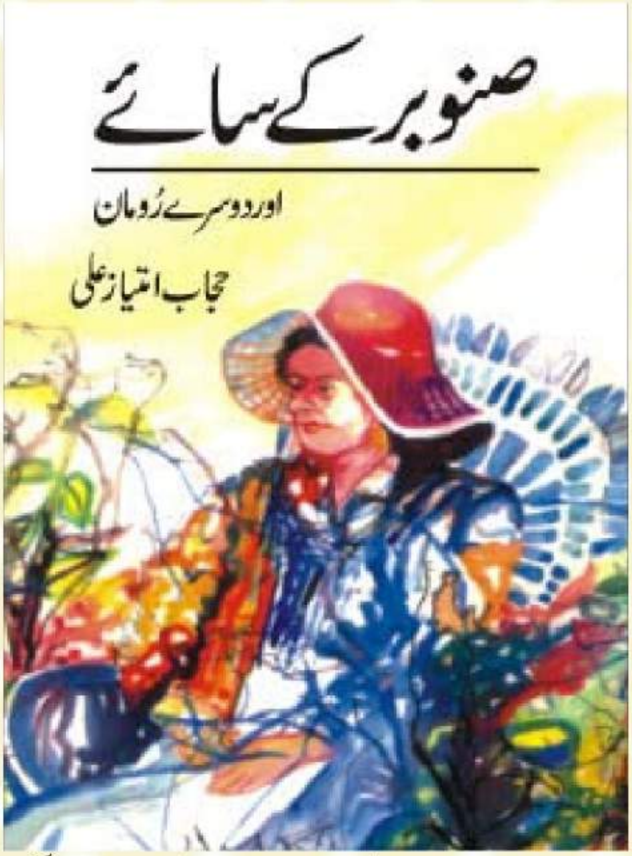

توہم پرست زمانے کے بوڑھے نے بیوی کے خواب میں دیکھے فرشتے کا کہنا سچ ثابت کر دیا۔افسانے کے اختتام میں بوڑھے کی افسوس ناکی اور بے بسی کو دکھایا گیا ہے۔افسانے میں آج کا بوڑھا کئی سال پہلے توہم پرستی کا شکار تھا لیکن بوڑھا اب اس زمانے میں جی رہا ہے جہاں توہم پرستی کو عیب جانا جاتا ہے۔معاشرہ باشعور و بیدار ہو رہا ہے اور اسی بیداری کی طرف افسانہ نگار نے اپنے قارئین کو متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

اردو افسانے میں ایک منفرد آواز 1932 میں مجموعے ''انگارے'' کی صورت میں ابھری۔اس مجموعے کی اشاعت اردو ادب کے لیے ایک چنگاری ہی نہیں بلکہ انقلاب کی نوید تھی۔اس مجموعے کے شریک مصنفین میں ایک اور اکیلی خاتون ڈاکٹر رشید جہاں ہے۔رشید جہاں اردو ادب کی پہلی ادیبہ ہیں جنھوں نے جنس جیسے شجر ممنوعہ کے قریب جانے کی ہمت کی۔

انھوں نے نفسیاتی سطح پر معاشرتی اور فرد کی کجرویوں کو سمجھنے، سمجھانے اور دکھانے کی کامیاب کوشش کی۔ ''انگارے'' میں شامل ان کے ڈرامے ''دلی کی سیر'' کی اشاعت کے بعد ہر طرف سے تہلکہ مچ گیا۔ ان کو ''رشید جہاں انگارے والی'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ان کے افسانوں میں ہمیں روایت سے پوری طرح انحراف دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ جدید ذہن کی مالک تھیں، وہ معاشرے میں تبدیلی کا بیج بونا چاہتی تھیں۔ ان کا ایک مشہور افسانہ ''آصف جہاں کی بہو'' ہے جس میں انھوں نے فرسودہ اذہان کے مالک کی عورتوں کی روداد بیان کی ہے۔ افسانے میں انقلابی فکر دیکھنے کو ملتی ہے۔ آصف جہاں کے یہاں ایک اکلوتا بیٹا ''نورالحسن'' تھا جس کی شادی وہ اپنی نند ''کبرا بیگم'' کی بیٹی کے ساتھ کرانا چاہتی تھی لیکن کبرا بیگم کے یہاں پانچ بیٹے ہو چکے تھے، چھٹا بچہ پیدا ہونے والا تھا، آصف جہاں دعائیں کرتی کہ کبرا کے یہاں اس بار لڑکی ہو جو میری بہو بنے۔ بچہ جننے کے وقت کبرا کی حالت غیر ہو رہی تھی کچھ عورتیں آپس میں باتیں کر رہی تھیں کہ کسی لیڈی ڈاکٹر کو بلا کر کبرا کا صحیح علاج کروایا جائے لیکن اسی سماج میں رہنے والی فرسودہ ذہن کی دوسری عورتیں کبرا کا علاج روایتی طور پر دایہ سے کرانا چاہتی تھیں۔

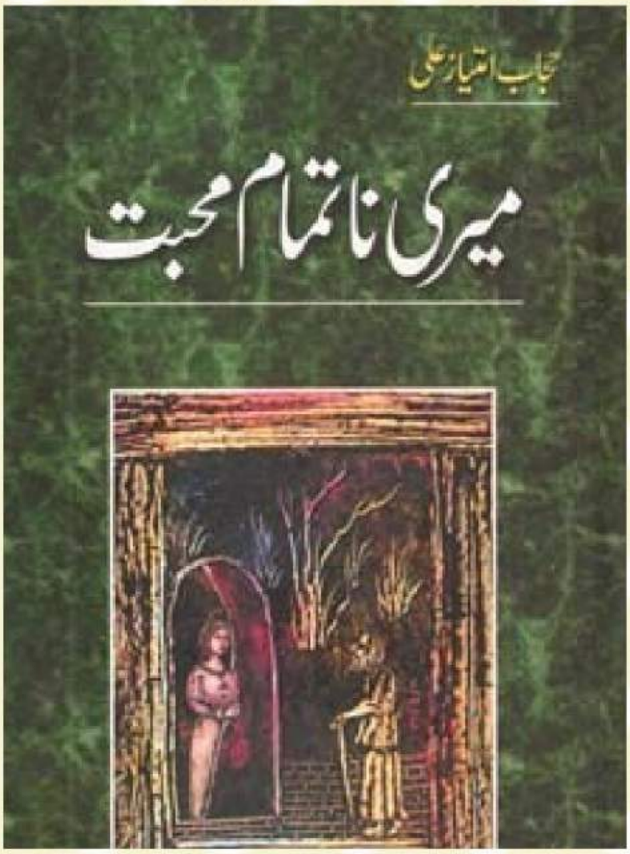

اس افسانے میں افسانہ نگار نے دونوں طرح کی عورتوں کا تذکرہ کیا ہے لیکن رشید جہاں جس عورت کا تعارف کرانا چاہتی ہیں وہ جدید ذہن کی وہ عورت ہے جو فرسودہ روایت کی پابندی سے آزاد ہو کر ایک آزادانہ اور عقلمندانہ زندگی گزارنے کی روادار ہے۔ ان کے افسانوں میں عورتوں کے حقوق کی بحالی اور ان کے معاشی وخانگی مسائل کو اجاگر کرنے کی سعی دیکھنے کو ملتی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں مردوں کے ہاتھوں عورتوں کا استحصال اور طوائفوں کی زندگی کا حقیقی روپ بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔

''انگارے'' میں ڈرامہ ''دلی کی سیر'' میں وہ ہندوستانی عورت کی ازدواجی زندگی، اس کی بے بسی، اس پر روا رکھے جا رہے سماجی ظلم و جبر کو سامنے لائی ہیں۔ رشید جہاں حقیقی زندگی میں عورتوں کو جیسے دیکھنا چاہتی تھیں وہی عورت ان کے افسانوں میں نمایاں ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ابوبکر عباد اپنی تصنیف ''تقلید سے پرے'' میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اردو افسانے کی تاریخ میں رشید جہاں سماجی حقیقت نگاری کے اعتبار سے پریم چند کے بعد دوسری لیکن انقلابی فکر، بے باک طرز بیان اور طنزیہ انداز اپنانے اور کہانیوں میں جنسی مسائل کا برملا اظہار کرنے والی پہلی افسانہ نگار ہیں جن کا ذہن سائنسی اور طریقہ استدلال منطقی ہے۔''

(ابوبکر عباد، تقلید سے پرے، بک کارپوریشن، دہلی 2016، ص38)

اردو ادب میں عالمگیر سطح پر ہونے والی سیاسی اور فکری تبدیلی کے پیش نظر جو تحریک ابھری وہ ترقی پسند تحریک ہے۔ 1936 میں ابھرنے والی یہ تحریک اردو ادب کے لیے ایک تغذیہ جان ثابت ہوئی۔ اس تحریک نے اردو ادب میں رومانی اور ماورائی فضاؤں کو پس پشت ڈال کر اس میں زندگی کی ہر طرح کی حقیقت کو ادب کے آئینے میں دیکھنے کی طرح ڈالی۔ اس تحریک نے فرد کے مسائل سے زیادہ سماجی حقیقت پسندی پر زور دیا۔ اس دور کے تقریباً سبھی ادباء اس تحریک سے متاثر ہوئے۔

پریم چند کے ساتھ چوٹی کے افسانہ نگاروں مثلاً منٹو، بیدی، کرشن چند، اختر اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس وغیرہ کے ذریعے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر افسانے منصہ شہود پر آئے۔ مرد افسانہ نگاروں کے شانہ بہ شانہ چلنے والی خواتین افسانہ نگاروں نے بھی اس تحریک سے وابستگی اختیار کی۔ ایسی افسانہ نگار خواتین میں جمیلہ ہاشمی، خالدہ اصغر، زہرہ جمال، ممتاز شیریں، عصمت چغتائی، رضیہ سجاد ظہیر اور قرۃ العین حیدر کا نام شامل ہے۔ ترقی پسند تحریک میں عورتوں نے حصہ لے کر اردو افسانے کی روایت کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ اس صنف سخن کے موضوعات کو تنوع اور جلا بھی بخشی۔ جمیلہ ہاشمی نے اپنے افسانوں میں زیادہ تر نسوانی کرداروں کی نفسیات اور ان سے جڑے ہر رشتے پر قلم اُٹھا کر پراثر انداز میں ان کی

عکاسی کی ہے۔خالدہ اصغر نے افسانوں میں علامتوں کے ذریعے اردو افسانے کے کینوس کو وسعت عطا کی۔

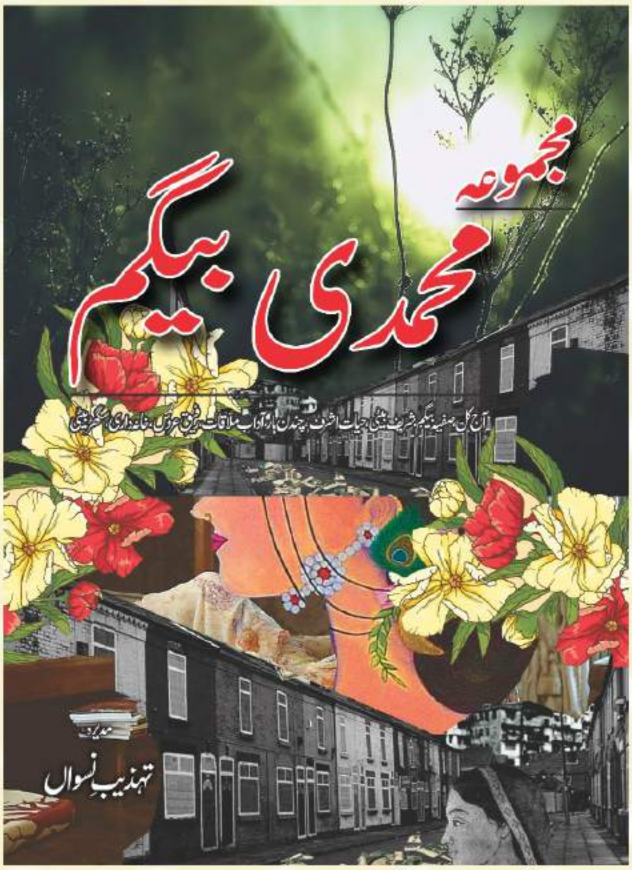

ترقی پسند افسانے کی سب سے فعال خاتون افسانہ نگار عصمت چغتائی تھیں۔عصمت اردو ادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔اردو افسانے کے اُفق پر وہ ایسے درخشندہ ستارے کی مانند ہیں جس نے اپنے افسانوی ادب کو سماجی حقیقت نگاری کے قریب کیا۔افسانے کی ابتداء میں رشید جہاں کے بعد بے باک اور عورتوں کے مسائل کا برملا طور پر اظہار کرنے والی خاتون افسانہ نگار عصمت چغتائی ہیں۔ابتدا سے ہی ان کے فن میں پختگی دیکھنے کو ملتی ہے لیکن ان کی شہرت فن کی پختگی کی وجہ سے نہیں بلکہ انقلابی فکر، نڈر اندازِ بیاں اور جنسی مسائل کو کھلے طور پر پیش کرنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔انھوں نے اپنی کہانیوں میں ہندستان کے متوسط طبقے کے مسلم گھرانوں کی عورتوں کو موضوع بنایا ہے۔عصمت نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی وہاں عورتوں کو گھر کی چار دیواری تک محدود رکھا جاتا تھا لیکن ان کی سوچ اس کے برعکس تھی۔انھوں نے عورتوں کے مسائل پر بے باک ہو کر لکھا، عورتوں کی نفسیات اور ان کے جنسی مسائل کو انھوں نے ایک نئی روش عطا کی۔جنس کو فحاشی قرار نہ دینے والی عصمت چغتائی نے جنسی موضوعات پر کھلے طور پر لکھا اور اسے سماجی حقیقت کا نام دے کر پیش کیا۔

جنسی موضوع پر لکھی گئی ان کی مشہور کہانی ’’لحاف‘‘ ہے۔یہ کہانی معروف ہونے کے ساتھ ساتھ متنازعہ بھی ہے۔اس کہانی میں انھوں نے عورتوں کے جنسی مسائل کو بے باکانہ اندازِ بیان کے طور پر پیش کیا ہے۔اس افسانے میں جب پہلی بار ایک عورت نے بے باکی سے جنسی جذبات کی کیفیت کا اظہار کیا تو ناقدین نے ان پر فحش گوئی کا الزام لگایا، لیکن عصمت جیسی عظیم افسانہ نگار ان الزامات سے بے پرواہ ہو کر حقائق کو تخلیقی انداز میں سامنے لاتی رہیں۔بقول محمد حسن:

> ’’عصمت چغتائی سے پہلے کسی خاتون نے اپنے داخلی تجربات، جنسی آرزومندی اور جذبات کے والہانہ پن کو ظاہر کر کے رسوائی مول لینا پسند نہ کیا تھا۔‘‘

(بحوالہ: خورشید زہرہ عابدی، ترقی پسند افسانے میں عورت کا تصور، اردو گھر انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، 1987ء ص 129)

انھوں نے اپنے افسانوں میں نہ صرف عورتوں کے مسائل کو اجاگر کیا ہے بلکہ بچوں کی نفسیات پر بھی انھیں گہری دسترس حاصل تھی۔بچوں کے احساسات و جذبات کو اکثر سمجھنے میں کوتاہی رہتی ہے لیکن عصمت کے یہاں یہ کوتاہیاں نظر نہیں آتیں اس کی عمدہ مثال افسانہ ’’بھول بھلیاں‘‘ میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

عصمت جس دور میں جی رہی تھیں اس وقت مرد و عورت کے درمیان ایک گہری خلیج حائل تھی۔عورتوں کے حقوق کی بات کرنا کبیرہ گناہ سمجھا جاتا تھا لیکن انھوں نے عورتوں کی نفسیات کو پرکھ کر ان گرہوں کو کھولنے کی کوشش کی جو اس وقت کے معاشرے میں رائج تھیں۔ان کے مطابق ’’اگر مرد چیخ سکتا ہے تو عورت بھی اس کا حق رکھتی ہے‘‘۔عصمت ادب کو نہ صرف سماج کا آئینہ سمجھتی تھیں بلکہ ادب کو سماج کے مسائل کا مداوا بھی گردانتی تھیں۔

ترقی پسند دور میں عورتوں نے جس جوش و ولولے سے ادب تحریر کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔عصمت جیسی ممتاز افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ اردو افسانے میں ابھرنے والا ایک اہم نام ’’رضیہ سجاد ظہیر‘‘ کا ہے۔انھوں نے اپنے ادبی سفر کی شروعات مضامین سے کی۔شروع شروع میں وہ عورتوں کے رسائل و جرائد میں لکھنے لگیں لیکن جلد ہی ان کا نام خاکہ نگاروں اور کہانی کاروں کی صف میں شامل ہو گیا۔ان کے افسانوں کے موضوعات مسلم گھرانے کے متوسط طبقے ہوا کرتے تھے۔ان کے افسانوں میں عورتوں کی بے بسی اور مظلومیت کا اظہار کھل کر کیا گیا ہے۔افسانہ ’’نیچ‘‘ میں عورت کے ذاتی مسائل کے لیے احتجاج کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔اس میں

'شاملی' (کردار) کی زندگی پر مبنی ایک نفسیاتی کہانی ہے جس میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک عورت جب مرد کے ظلم و جبر سے تنگ آتی ہے تو وہ باغی بن کر الگ راہ اختیار کرتی ہے۔ افسانے میں 'سلطانہ' نام کی عورت جب 'شاملی' سے جاننا چاہتی تھی کہ اس نے اپنے شوہر کو کیوں چھوڑا، تو شاملی اس کا جواب یوں دیتی ہے:

"وہ سمجھتا تھا کہ روٹی کپڑا دے گا اور اپنا حکم چلائے گا، ہم کوئی چڑیا ہیں کہ روپے پیسے سے مول لے گا ہمیں ہمارے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں ہم کام کرتے ہیں اس جیسے دس کو کھلانے کی ہمت رکھتے ہیں ہم۔" (افسانہ: نیچ)

دراصل افسانہ نگار اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتی ہیں کہ ایک عورت جو چاہے، کر سکتی ہے، وہ کمزور یا کمتر نہیں ہے۔ افسانہ نگار اپنے معاشرے میں 'شاملی' جیسی تیز نڈر عورت کی خواہش رکھتی ہے۔ اس افسانے میں رضیہ سجاد نے 'شاملی' کو ایک فعال کردار بنا کر پیش کر کے اپنے معاشرے کی ان عورتوں کی آواز کو بلند کرنا چاہا ہے، جو اس وقت کے پدری نظام میں مردوں کے دباؤ میں اپنی غلامی کی سی زندگی کاٹ رہی تھیں۔ وہ سماج کو یہ بھی باور کرانا چاہتی ہے کہ جو کام مرد سماج میں انجام دیتا ہے وہ ایک عورت بھی بہ آسانی انجام دے سکتی ہے۔

ان کی متعدد کہانیاں عام عورتوں کے ہی ارد گرد گھومتی ہیں۔ اسی لیے انھوں نے اپنی کہانیوں میں عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے جس میں نہ تو آورد ہے اور نہ ہی تصنع بلکہ ان کی عبارت ایسی دلکش و دلنشین ہے کہ بات دل سے نکل کر دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

اس دور میں جہاں رضیہ سجاد نے ایک طرف عورت کو باغی بنا کر پیش کیا وہیں دوسری طرف ممتاز شیریں نے عورت کو گھر کی زینت بنا کر پیش کیا۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں زیادہ تر عورت کی کامیاب ازدواجی زندگی کے موضوع کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے عموماً زندگی کے خوشگوار لمحات کی عکاسی کی ہے۔ ان کے یہاں ترقی پسندی کے تمام عکس صاف نظر آتے ہیں۔ افسانہ "آئینہ" ممتاز شیریں کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کہانی میں ایک بوڑھی نانی کی داستان کو پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ شوہر جیسا بھی ہو بیوی محبت کرنے والی، وفادار اور اطاعت گزار ہونی چاہیے، شوہر کتنے بھی ظلم و جبر کیوں نہ کرے بیوی پھر بھی مسکرا کر پیش آنی چاہیے۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک وفادار بیوی (نانی بی) ہے۔ وہ اپنے شوہر کی فرماں بردار ہونے کے ساتھ ساتھ شوہر کے تمام ظلم و جبر کو بہ آسانی اور خوشی خوشی برداشت کرتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کا مقصد صرف شوہر سے والہانہ محبت، وفاشعاری اور خدمت گزاری سمجھتی ہے۔

ممتاز شیریں کے مطابق ازدواجی زندگی کی سیڑھی صرف عورت کی وجہ سے کھڑی اور ٹھہری ہوتی ہے۔ اگر عورت اس رشتے سے ایک قدم پیچھے ہٹا لے تو اس میں کچھ باقی نہیں رہے گا۔ ممتاز شیریں عورت کے مقابلے میں زیادہ درجہ مرد کو دیتی ہیں۔ انھوں نے عورتوں کو بنیادی حیثیت نہ دیتے ہوئے ان کو زندگی کی نشو نما کے لیے لازمی جز قرار دیا ہے۔ ان کے افسانوں کی قرآت سے معلوم ہوتا ہے کہ ازدواجی محبت اور ازدواجی زندگی ممتاز شیریں کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ ممتاز شیریں کے موضوعاتی کینوس کے حوالے سے ڈاکٹر ابوبکر عباد یوں لکھتے ہیں:

"ممتاز شیریں کے افسانوں کا ایک اہم اور دلچسپ موضوع نفسیات ہے۔ چنانچہ "انگڑائی"، "آئینہ" اور "شکست" میں انھوں نے انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان افسانوں میں انھوں نے کرداروں کے ظاہر سے زیادہ ان کے باطن پر توجہ دی ہے"

(ابوبکر عباد، تقلید سے پرے، بک کارپوریشن، دہلی 2016، ص122)

ممتاز شیریں ماہر نفسیات تو نہ تھیں لیکن ان کے افسانوں میں نفسیاتی عناصر نمایاں ہیں۔ ان کی کہانیوں میں مرکزی کردار کے طور پر زیادہ تر عورت ہی نظر آتی ہے۔ ان کے افسانوں میں بیانیہ تکنیک کے استعمال کے ساتھ ساتھ ماضی اور حال کا دلچسپ امتزاج بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

جدیدیت اور مابعد جدیت کے دور میں خواتین افسانہ نگاروں نے اپنی ایک الگ پہچان قائم کی اور عصر حاضر میں بہت ساری خواتین ہنر مندی کے ساتھ اردو افسانے کی آبیاری میں لگی ہوئی ہیں۔ اب یہ خواتین کسی کی اتباع میں ادب خلق نہیں کرتیں بلکہ انھوں نے اپنی راہ الگ متعین کی ہے، جس کی اب کئی مرد ادبا بھی تقلید کرتے نظر آتے ہیں۔ ان میں چند اہم نام شائستہ فاخری، ترنم ریاض، صادقہ نواب سحر، قمر جمالی وغیرہ کے ذکر ہیں۔ یوں اردو کی خواتین نگاروں نے سپہ گری سے سپہ سالاری تک کا سفر طے کیا اور آج بھی مسلسل محو سفر ہیں۔ □□□

Orusa Farooq
Research Scholar
Dept. of Urdu
Kashmir University
Srinagar-190006 (J & K)

کے۔اطہر صائمہ

غربت کی نسوان کاری

ہندوستانی تناظر میں

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس میں مختلف مذاہب کے لوگ، مختلف بولیوں اور مختلف رسم و رواج کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے جس کے مشہور اور وسیع آئین کے مطابق مرد اور عورت مساوی حقوق کے حق دار ہیں۔ لیکن عملی طور پر دیکھا جائے تو مرد اور عورت کے درمیان مساوی حقوق اور مساوات کی صورتِ حال کچھ اور ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ جس کی اولین جھلک ہمیں ہندوستان کی مردم شماری کے اعداد و شمار سے ملتی ہے۔

ہندوستان میں 2011 کی مردوم شماری کے مطابق کل آبادی 1.21 بلین ہے۔ جس میں مرد اور عورت کا تناسب 943/1000 ہے مطلب 1000 مرد پر 943 خواتین۔

وزارت شماریات اور پروگرام پر عمل درآمد* کے مطابق ہندوستان کی مردوم شماری میں جنسی تناسب کو حسب ذیل جدول کے ذریعہ بتایا گیا ہے اور دنیا بھر کے کل 201 ممالک میں جنسی تناسب کے جدول میں ہندوستان کا مقام 191 پر موجود ہے جو کہ ہندوستان میں جنسی غیر متناسب تناسب کی گواہی دیتا ہے۔

جنسی	مرد	خواتین
تناسب	1000	930
فیصد	51.8%	48.2%

*Ministery Of Statistics and Programme Implementation

1.21 بلین آبادی رکھنے والے ملک کی مجموعی ملکی پیداوار (GDP) یعنی معیشت کا ڈیٹا کچھ اس طرح سے ہے۔ عالمی بینک کے مطابق گزشتہ تین سالوں میں ہندوستان کی معیشت کے اعداد و شمار کو حسب ذیل جدول میں پیش کیا گیا ہے۔

نمبر	سال	(GDP) ملک کی مجموعی پیداوار
1	2016	8.2
2	2017	7.2
3	2018	7.0

(GDP=Gross Domestic Product)

عالمی بینک کے مطابق پچھلے 3 سالوں میں ملک کی مجموعی پیداوار کے تناسب کو آبادی کے تناسب میں دیکھا جائے تو بہت زیادہ فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔ جس میں ملک کی مجموعی پیداوار کے نمو میں ہر سال گھٹتا ہوا منظر نظر آتا ہے جو کہ کسی بھی ترقی پذیر ملک کی ترقی کے لیے رکاوٹ کا سبب بنتا ہے۔ جس کے راست اثرات ملک کی معیشت پر رونما ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہندوستان میں ملک کی بیشتر آبادی جو کہ خط غربت میں رہتی ہے وہ غربت کے اور بھی قریب ہو جاتی ہے۔ نیز اس غربت کی اولین شکار خواتین ہی ہوتی ہیں۔

کیونکہ عورت ہی تو ہے جو گھر کے تمام افراد کی تیمارداری کرتی ہے جس میں چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال، بڑے بزرگوں کی تیمارداری، نیز چولہا

چوکا سنبھالنا وغیرہ ہے۔ ان سب کاموں کے ساتھ ساتھ سماج کی بنائی ہوئی صنفی امتیازات کی حد بندیوں میں عورت کو گھر کی چہار دیواری میں ہی محصور کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے عورت گھر کی پریشانیوں میں بُری طرح پھنس جاتی ہے۔ مشترکہ خاندانوں میں عورت کی حالت اور بھی بدتر ہوتی ہے۔ کیونکہ جب کسی خاندان پر غربت کی وباء حاوی ہوتی ہے تو سب سے پہلے اُس خاندان میں رہنے والی خواتین ہی اُس وبا کا شکار ہوتی ہیں۔ نیز اس اصطلاح کو بیان کرنے والا جدید لفظ ہی غربت کی نسواں کاری کہلاتا ہے۔ جس کو انگریزی میں Feminization of Poverty کہتے ہیں۔

غربت کی نسواں کاری کی اصطلاح 1976 میں ڈیانا پیئرس (DianaPierce) نے دی۔ جو کہ 1960 میں ریاست متحدہ (یو۔ایس) میں رہنے والے غریب افراد کے رہن سہن میں درپیش تبدیلیوں کا احاطہ کرتے ہوئے "ڈیانا پیئرس" نے محسوس کیا کہ عورت اور غربت کے درمیان بہت ہی گہرا تعلق ہے۔ اسی لیے 'ڈیانا پیئرس' نے اس تصور کو انگریزی میں Feminization Of Poverty کی اصطلاح سے نوازا اور جس کا ترجمہ اردو میں غربت کی نسواں کاری سے موسوم ہے۔ نیز غربت کی نسواں کاری کو 'ڈیانا پیئرس' حسب ذیل دی گئیں وجوہات کو قرار دیتی ہیں:

☆ خاندان کی ساخت میں ہونے والی تبدیلی جس میں طلاق شدہ خواتین میں خاتون سربراہ خاندان کے تناسب کا بڑھ جانا۔

☆ طلاق شدہ خواتین میں طلاق کے بعد بچوں کی ذمہ داری عورت پر ہونا۔

☆ صنفی اعتبار سے معیشت میں فرق کا ہونا یعنی آمدنی میں صنفی فرق کا پایا جانا جس کو انگریزی میں Gender Gaps In Income کہتے ہیں۔

☆ جس میں صنفی امتیازات کی بنیاد پر وقوع پذیر کام کی صنفی تقسیم، تعلیم اور خواتین کی غیر پیداواری گھریلو مزدوری جیسے عوامل "غربت کی نسواں کاری" کو بڑھاوا دیتے ہیں۔

☆ انہی سب وجوہات کی بنا پر خاتون سربراہ خاندانوں میں موجود خواتین غربت کے اور بھی نزدیک ہو جاتی ہیں، اسی تصور کو "ڈیانا پیئرس" نے (Feminization Of Poverty) یعنی "غربت کی نسواں کاری" کی اصطلاح کو، بنیاد بنا کر وضاحت کی ہے۔

غربت کی نسواں کاری کی اصطلاح 1976 میں ہوئی لیکن اس اصطلاح کی صورت حال عملی طور پر صدیوں سے چلی آ رہی ہے جو کہ صنفی عدم مساوات کی ایک شگاف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ نیز سماج میں وقوع پذیر پدرسری نظام کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی تھی۔

UNIFEM (United Nations Development Fund for Women) کے مطابق "غربت کی نسواں کاری" کی تعریف کچھ اس طرح سے ہے۔ "غربت میں خواتین کی غیر متناسب نمائندگی ہوتی ہے۔ اور یہ ایک ایسا رجحان ہے، جس میں غربت کے اعتبار سے مرد کے مقابلہ میں خواتین کی شرح زیادہ پائی جاتی ہے۔" جس کو UNIFEM نے غربت کی نسواں کاری کا تصور قرار دیا ہے۔

'وبھوتی پٹیل' جو کہ سماجی علوم کے میدان میں خواتین سے جڑے مسائل پر آواز اٹھانے والی ایک مشہور مفکر ہیں، وہ اپنے مقالے میں غربت کی نسواں کاری کے تعلق سے کچھ اس طرح اظہار خیال کرتی ہیں کہ 'غربت کے اعتبار سے مرد اور عورت کے درمیان ایک شگاف ہوتی ہے جو کہ سماج میں وقوع پذیر صنفی امتیازات کی وجہ سے پائی جانے والی پختگی کی وجہ سے اس غربت والی شگاف کی وسعت میں پچھلے دس سالوں میں کافی پھیلاؤ ہوا ہے"۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ مرد کے مقابلہ میں عورت کس حد تک غربت کی وبا سے گھری ہوئی ہے۔ جس کا اثر راست طور پر ملک کی معیشت پر پڑتا ہے۔

'غربت کی نسواں کاری' ایک نئی اصطلاح ہے جو کہ 20ویں صدی کی آخری دہائیوں میں مغربی ممالک میں ابھری۔ لیکن عملی طور پر اس

اصطلاح کے معنی ساری دنیا میں پچھلی کئی صدیوں سے عمل میں ہیں، جو کہ سماج میں وقوع پذیر صنفی امتیازات کی وجہ سے پوشیدہ رہی ہیں۔ نیز موجودہ اصطلاح ہمیں اس بات کی طرف توجہ دلاتی ہے کہ عورت کو سماج میں صنفی امتیازات کے ساتھ ساتھ غربت کا ظلم بھی سہنا پڑتا ہے، چاہے وہ چین، ہندوستان، جاپان یا پھر امریکہ ہی کیوں نہ ہو۔ جس کا ثبوت ہمیں عالمگیریت کے تصور سے ملتا ہے، کیونکہ کہیں نہ کہیں عالمگیریت کے اثرات بھی اس غربت کی وبا کو عورت کے اور بھی قریب پہنچانے کا کام کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے سماج میں غربت دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔

اگر دیکھا جائے تو عالمگیریت ایک اصطلاح ہے، جس کے معنی دنیا بھر میں مختلف ممالک کے درمیان ثقافتی، سیاسی، معاشی طور پر باہمی رابطہ پیدا کرنے کا ایک نظام ہے۔ نیز عالمگیریت ایک عالمی تحریک ہے جو کہ معاشی، تجارتی، مالی، ترسیل کے ذرائع کو انضمام کرنے کی پہل کرتی ہے۔ عام زبان میں عالمگیریت کے معنی دنیا بھر کے مختلف ممالک کو ایک دوسرے سے رابطہ قائم کروانے کا ایک ذریعہ ہے۔ جس میں ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک کو معاشی اعتبار سے ترقی کرنے کے لیے مختلف ذرائع فراہم ہوتے ہیں۔ لیکن عملی طور پر دیکھا جائے تو ملک میں غربت کی جڑوں کو مظبوط بنانے میں کہیں نہ کہیں عالمگیریت بھی ایک وجہ بنی ہے۔ کیونکہ ترقی کی راہ میں عالمگیریت کی وجہ سے سب سے زیادہ نقصان اقلیتوں، غریبوں اور خواتین کو ہی ہوا ہے۔

دنیا بھر کی خواتین کو سماج میں دو طرح کے ظلم سہنے پڑتے ہیں، جس میں پہلا ہے سماج میں وقوع پذیر صنفی امتیازات اور دوسرا، معاشی اعتبار سے غیر مستحکم جس کے ذریعہ غربت کی نسواں کاری کے منفی اثرات رونما ہوتے ہیں۔ جس میں خواتین کو گھر میں اور کام کی جگہ اُجرت کے اعتبار سے عدم مساوات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نیز کام کے اوقات میں بھی خواتین کو عدم مساوات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے خواتین اپنی محنت اور صلاحیت کے باوجود غربت کی وبا میں بُری طرح پھنس جاتی ہیں۔

مہاتما گاندھی نے غربت کے حوالے سے کہا تھا کہ Poverty is the worst Form of violence" یعنی غربت ایک بد ترین تشدد ہے۔ جو کہ کسی بھی انسان کے وجود کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ اس غربت کے تشدد میں گھرا کوئی بھی انسان ترقی کی راہوں سے بھٹک جاتا ہے۔ جس کا اثر راست طور پر ملک کی معیشت پر پڑتا ہے اور وہ دن بہ دن اس غربت کی وباء میں پھنستا چلا جاتا ہے۔ نیز خواتین کے معاملے میں یہی غربت کی وبا کی صورت حال دوگنی ہوجاتی ہے۔ جس کی جھلک ہمیں خان سربراہ خاندان کی خواتین کی زندگی میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ جس کو ہم اس طرح سے بھی کہہ سکتے ہیں کہ خاتون سربراہ خاندانوں میں خواتین دو طرح کے تشدد کا شکار ہوتی ہیں جس میں پہلا غربت اور دوسرا صنفی عدم مساوات سے جڑے مسائل ہوتے ہیں۔

ہندوستان میں غربت کی خط کو جانچنے اور غربت کی پختگی اور اس کے مضر اثرات کا معائنہ ملک کی حکومت نے مختلف کمیٹیوں سے کروایا تھا اور ان کمیٹیوں کی رپورٹس بھی اسی بات کو کہتی ہیں کہ ملک میں (BPL) یعنی خطِ غربت کے نیچے رہنے والوں کی آبادی زیادہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملک میں غربت کے مضر اثرات، پختگی کے ساتھ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ گاؤں ہو یا شہر ہندوستان کی آبادی میں غربت کی وباء میں لپٹ کر زندگی بسر کرنے والے ہر جگہ موجود ہیں اور اُن مختلف کمیٹیوں میں سے دو کمیٹیوں کی رپورٹ کو حسب ذیل جدول میں پیش کیا گیا ہے:

کمیٹیس	دیہی تناسب	شہری تناسب	کُل
لکڈ وال کمیٹی	28.3	25.7	27.5
تنڈولکر کمیٹی	41.8	27.5	37.5

ملک میں آزادی سے لے کر عصرِ حاضر تک سماجی مسائل کی جڑیں

کہیں نہ کہیں غربت سے جڑی ہوئی ہیں، جس کے مضر اثرات آج بھی ہمیں زندگی کے ہر موڑ پر درپیش ہوتے ہیں۔ ان مضر اثرات کی اولین شکار تقریباً خواتین ہی ہوتی ہیں، کیونکہ غربت اور خواتین کے درمیان کا رشتہ بہت ہی گہرا ہوتا ہے۔

غربت ایک ایسا مسئلہ ہے جو دنیا کے ہر کونے میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے اور خاص کر ترقی پذیر ممالک میں بہت زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے وہ ہے جبکہ بہت سارے غیر حکومتی ادارے اور حکومتی ادارے غربت کے اثرات کو کم کرنے کی کوشش میں رواں دواں ہیں۔ باوجود اس کے، غربت کی وباء کو جڑ سے ختم کرنے میں آج بھی غیر حکومتی ادارے اور حکومتی ادارے کامیابی سے کوسوں دور ہیں۔ غربت کے اثرات اور غربت کا بول بالا ترقی پذیر ممالک میں ہی زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے۔

ترقی پذیر ممالک میں غربت کو کم کرنے کے لیے سب سے پہلے تعلیم اور صحت پر توجہ دینی ہوگی کیونکہ غربت کی وجہ کہیں نہ کہیں بڑھتی ہوئی آبادی ہے۔ جہاں پر ماں باپ اپنے بچوں کو وٹامن اور پروٹین سے بھر پور کھانا کھلانے میں ناکامیاب ہیں، جس کی وجہ غربت ہے اور اس کا راست اثر بچوں کے دماغ پر پڑ رہا ہے، جس کی وجہ سے بچے تعلیم کے میدان میں صحیح اعتبار سے آگے بڑھ نہیں پاتے۔ اسی لیے حکومتی اور غیر حکومتی اداروں کو چاہیے کہ تعلیم اور صحت کے میدان میں مکمل اقدامات کے ساتھ آگے بڑھ کر غربت کو جڑ سے ختم کرنے میں کامیابی حاصل کریں۔ نیز صنفی امتیازات کو ختم کرتے ہوئے خواتین پر غربت کی وجہ سے ہونے والے مضر اثرات کو بھی ختم کرنے میں کامیابی حاصل ہوسکتی ہے۔

غربت دیہی علاقوں میں بہت زیادہ ہے جس کی اہم وجہ کہیں نہ کہیں سماج میں وقوع پذیر پدرسری نظام ہے جس کی وجہ سے خواتین کو اپنے حقوق سے دوری بنائے رکھنی پڑتی ہے۔ جس میں خواتین کو جائیداد کے حق سے محروم ہونا پڑتا ہے اور تو اور دیہات میں رہنے والی خواتین نہ صرف پدرسری نظام سے دوچار ہیں بلکہ ان کی حیثیت کو غربت کے اعتبار سے بدتر بنانے میں کچھ اہم وجوہات یہ بھی ہیں کہ خواتین کو ابتدائی طبی امداد کا فراہم نہ ہونا، تعلیم کا نہ ہونا، تخلیقی صلاحیتوں کو سنوارنے کے مواقعوں سے دوری اور معاشی استحکام سے دوری وغیرہ ہے۔ جس کی وجہ سے خواتین ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔

سماج میں خواتین کی حیثیت کو بہتر بنانے کے لیے خواتین کو تعلیم کے ساتھ ساتھ معاشی مدد بھی فراہم کرنی ہوگی۔ تب ہی خواتین اس صورت حال سے باہر آسکتی ہیں اور کچھ حد تک سماج میں مساوی حقوق کو حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوسکتی ہیں۔ نیز اس کی ذمہ داری سماج میں موجود ہر فرد پر عائد ہوتی ہے۔ تبھی ہم سب ذمہ دار شہری کہلائیں گے۔ خواتین کو اس حالت سے نکال کر ملک کی ترقی کا حصہ بنا سکتے ہیں اور سماج میں صنفی مساوات کو فروغ دینے میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

کتابیات:

(1) Gimenez, M. E. (1990). The Feminization of Poverty: Myth or Reality? Social Justice/Global Options, 17(3 (41.)

(2) Kimenyi, M. S., & Mbaku, J. M. (1995). Female Headship, Feminization of Poverty and Welfare. Southern Economic Journal, 62(1), 44-52.

(3) Peterson, J. (1987). The Feminization of Poverty. Journal of Economic Issues, 21(1), 329-337.

(4) Pressman, S. (2003). Feminist Explanations for the Feminization of Poverty. Journal of Economic Issues, 37(2), 353-361.

(5) Brandtzaeg, B. (1979, November 24). Women,Food and Technology:Case of India. Economical Political

(6) Lootens, T. (1983). The International Feminization of Poverty. Off Our Backs, 13(8), 5-6.

(7) SRIVASTAVA, N., & SRIVASTAVA, R. (2010). Women, Work, and Employment Outcomes in Rural India. Economic and Political Weekly, 45(28), 49-63.

(8) Kleinman, S. (2007). Feminist Fieldwork Analysis. New Delhi: Sage Publication, Inc

(9) http://censusindia.gov.in/

(10)https://www.youtube.com/watch?v=2dvnndfvKuA&t=44s

□□□

Miss. Athher Saaima

Ph.D Research Scholar

Department of Women Education

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli

Hyderabad-500032 (T.S)

فرحت نادر رضوی

پناہ

ارے واہ بھابھی جان، آپ تو بالکل بھی نہیں بدلیں! بلکہ پہلے سے کچھ اور نکھر گئیں ہیں،

وہ نہا کر آنگن میں کھڑی تھی، تولیے سے جھٹک کر بال خشک کرتے کرتے اس نے نظر اٹھائی تو اسے برآمدے میں عین اپنے سامنے پایا، چائے کا کپ اس کے ہاتھوں میں تھا اور نگاہ اس کی نگاہوں میں، جیسے دررانہ دل کے اندر داخل ہوئی جا رہی ہو۔

ہوں.....اس نے ذرا جھینپ کر دوپٹے کا آنچل اپنے بھیگے ہوئے کرتے پر پھیلایا، جو اس کے گیلے بالوں کی وجہ سے تر ہو کر اس کے بدن سے بالکل چپک گیا تھا۔

آ.....آپ.....کیسے ہو؟

جی، بالکل اچھا خاصا، ہٹا کٹا، آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔

اس نے سر پیچھے جھٹک کر ایک قہقہے کے ساتھ جواب دیا۔

آپ اپنی سنائیں.....

اس نے برآمدے کی سیڑھیاں طے کیں، اور اب آنگن میں عین اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

کیسی گزر رہی ہے...؟ سرسراتی ہوئی آواز میں ایک سرگوشی سی ہوئی۔

نہ جانے کیوں، آج اس کے قرب کے احساس سے اس کا پورا وجود جھنجھنا اٹھا۔

میں.....میں بھی ٹھیک ہوں، اس کی ہمت جواب دے گئی۔

بھائی کو دیکھ کر صدمہ ہوا.....اس بار وہ دو قدم دور ہو گیا۔

آپ بھابھی کتنی خوبصورت.....بلکہ حسین ہیں، اور.....اور جوان بھی، اور بھائی.....وہ تو بالکل ہی.....مفلوج ہو گئے، کیسے کٹتی ہے آپ کی؟

میں آپ کے لیے کھانا بناتی ہوں، کیا کھائیں گے آپ؟ وہ تیزی کے ساتھ مڑ کر کچن میں چلی گئی۔

کھانا تیار کرنے کے دوران ان کے ہاتھ دھیرے چل رہے تھے مگر دماغ، وہ تو نہ جانے کس رفتار سے ماضی کا سفر طے کر رہا تھا۔

کچن کی کھڑکی سے اچانک داخل ہونے والے ہوا کے تیز جھونکے اس کے دراز بالوں کو پریشان کر گئے تو اس نے اپنے گیلے بالوں کو سمیٹ کر ایک جوڑا سا بنا لیا، نہ جانے کیوں، آج اسے اپنے بال کچھ زیادہ ہی دراز سیاہ اور ریشمی سے محسوس ہوئے، جن کی سرسراہٹ اس کی گردن اور پشت پر بہت عجیب سے ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

اس کے شوہر وحید، نہایت محبت کرنے والے، مہربان اور بڑی جاذب نظر شخصیت کے مالک تھے، آج سے بیس سال قبل وہ دونوں اس

بارونق شہر میں آئے تھے۔ وہ بہت کمسن، شوہر پرست اور اطاعت گزار تھی، کبھی اس کے شوہر نے اسے کسی قسم کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ انہی دنوں جاوید کا اس کے گھر آنا جانا شروع ہوا، وہ معمولی شکل وصورت کا ایک کمسن لڑکا تھا، مگر اس کی آنکھیں... ان آنکھوں میں نہ جانے کیسی عجیب سی چمک تھی، اور نہ جانے کیسی کیسی تمنائیں اور تقاضے، وہ ہمیشہ ان نگاہوں سے گھبراتی تھی۔

شروع شروع میں وہ کتابیں پڑھنے اور مختلف موضوعات پر تبصرہ کرنے کی غرض سے آیا کرتا تھا۔ اس کے شوہر اسے بڑی شفقت کے ساتھ اپنی کتابیں دیتے، اس کے مقالے سنتے، اصلاح وتبصرہ کرتے اور اسے اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا بھی کھلاتے، اور کبھی کبھی تو رات زیادہ ہوجانے پر، وہ وہیں... باہر والے کمرے میں کاؤچ پر، کتابوں کے ڈھیر پر سر رکھ کر سو جایا کرتا تھا اور وحید وہیں اسے چادر اوڑھا آتے، نہایت دبے قدموں سے کمرے کی روشنی گل کر کے وہ باہر آتے، اور آہستگی سے دروازہ بند کردیتے۔

وہ ایک سیاہ اور گھٹا ٹوپ رات تھی، بے حد حبس اور گھٹن، شاید بارش ہونے والی تھی... اس نے قدموں سے ٹٹول کر سلیپر اپنے پیروں میں ڈالے اور نائٹ گاؤن برابر کرتی باہر آگئی اور... اندھیرے میں کسی چیز سے ٹکرا گئی... افف.... اس کے گھنے دراز بال جو کھلے ہوئے تھے، کسی چیز سے بری طرح الجھ گئے۔ وہ بری طرح لڑکھڑائی... مگر کسی نے اسے سنبھال لیا، شانے اور کمر سے سنبھال کر کھڑا کردیا۔

بھابھی ..... بھابھی .... معذرت .... یہ میں ہوں .... جاوید.....

معذرت..... میں... میں.....

مجھے گرمی لگ رہی تھی، لائٹ آف ہوگئی تھی.... میں باہر آگیا.... مجھے نہیں پتہ تھا آپ.....

اندھیرے میں دو ہاتھ اسے چھو رہے تھے..... اس نے جھرجھری لی.....

رکیے... رکیے..... شاید آپ کے بال میرے کڑے میں پھنس گئے ہیں.... میں نکالتا ہوں انھیں، رک جائیں..... ڈریے گا نہیں..... اور چلائیے گا بھی نہیں.... ورنہ بھائی جاگ جائیں گے اور پتہ نہیں کیا سوچیں گے۔

وہ تو حد درجہ خائف تھی اور عنقریب خوف سے چلا ہی پڑتی مگر حالات کی سنگینی کے احساس نے اس کے ہونٹ سی دیے۔ وہ بت بنی کھڑی رہی، جاوید نے بڑی مشکل سے اپنی کلائی میں پڑے کڑے سے الجھے اس کے بالوں کو آہستہ آہستہ الگ کیا اور پھر بغیر کچھ کہے باہر والے کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کرلیا۔

وہ وہاں کتنی ہی دیر سکتے کی کیفیت میں کھڑی رہی.... کچھ خوف، کچھ بدحواسی اور کچھ عجیب وغریب قسم کے تاثرات لیے وہ پوری رات اپنے بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔

اگلے ایک ہفتے تک نہ وہ جاوید کے سامنے گئی اور نہ جاوید پھر اس کے سامنے آیا۔

اسی دوران اس کی ماں کی علالت کی خبر آئی اور وہ اپنے مائکے چلی آئی۔ واپسی پر معلوم ہوا، جاوید کی نوکری لگ گئی اور وہ شہر سے باہر چلا گیا ہے۔

دفعتاً تیز ہوا کے کچھ اور جھونکے آئے... ماضی کے مزید اوراق کھل گئے.... جلتی ہوئی لو.... غضب کی تپش اور جھلسن.... وحید کو ان کے کالج کے لڑکے سنبھالے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوئے، شاید وہ بیہوش ہوگئے تھے۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا ہاتھ پیر اکڑے ہوئے تھے.... فوری طبی امداد بہم پہنچائی گئی، پھر ایک طویل عرصہ.... ہاسپٹل کے چکر..... دوائیں .... ڈاکٹر پہ ڈاکٹر تبدیل کیے گئے.... شہر در شہر ان کو لے کر ماری ماری پھری، بے تحاشہ پیسے خرچ کیے، دعائیں.... تعویز.... گنڈے..... وظیفے سب کچھ... مگر سب بیکار..... وحید اب محض آنکھیں جھپکا سکتے تھے۔ وہ سر تا قدم ان کے لیے وقف ہوگئی، گھر بھی اور باہر بھی۔

کم سن شہزاداب جوانی کی سرحدوں میں داخل ہوگیا تھا۔ اس کے کالج کے اخراجات.... تعلیم یافتہ تھی، شوہر کی جگہ بحالی ہوگئی... مگر اب وہ ایک عورت سے مشین بن چکی تھی، مسکرائے ایک زمانہ گزر گیا تھا، صبح جلدی میں تیار ہونا ہوتا.... نرس کے حوالے وحید کو کرتی.... ان کی دوائیں، چائے، کھانے کی ذمہ داریاں، نرس کو ایک ایک بات دس دس بار سمجھاتی.... نرس الجھ جاتی، مگر اس کو اطمینان نہ ہوتا۔ آفس سے فون کرتی، وحید کے متعلق مسلسل فکر مند رہتی۔ شہزاداب ہاسٹل چلا گیا تھا۔ آفس سے لوٹ کر ضروری امور نپٹاتی اور وحید کے بغل میں پلنگ پر لیٹ جاتی، سعادت مند بیٹا دن میں دو بار فون کرتا۔ مما پاپا کی خیریت، دوائیں، روزانہ کے طے شدہ سوالات، مما آپ نے کھانا کھا لیا؟ پاپا کی دوائیں ہیں؟ جی میں ٹھیک ہوں.... آپ اپنا خیال رکھیں.... اور بس۔ وہ کبھی کبھی ایک عجیب سی بے چینی محسوس کرتی.... وحید کو دیکھتی... مگر وہ پلکیں جھپکا جھپکا کر چھت کو تک رہے ہوتے۔ کبھی ان کے منہ کا لعاب صاف کرتی، کبھی ناک پونچھتی.... پھر آکر اپنے بستر پر لیٹ جاتی..... زندگی طے شدہ پٹری پر چل رہی تھی، اس کو اب ان چیزوں کی عادت سی ہوگئی تھی، کوئی شکایت بھی نہیں تھی کسی سے، مگر آج ...بیس برس بعد.... اچانک جاوید....

بھابھی میں کچھ مدد کر دوں؟ اس دفعہ وہ باورچی خانے میں بے تکلفانہ داخل ہوگیا، جگہ تنگ تھی، وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہوگئی....نہیں نہیں....ٹھیک ہے...ٹھیک ہے...آپ وحید کے پاس بیٹھیے میں کھانا بنا کر آ رہی ہوں۔

بھابھی....اس نے جیسے ایک آہ بھری۔

جی....؟

بے اختیار اس کی جانب نظریں اٹھ گئیں۔

بھابھی یہ سب....، آپ کیسے زندہ ہیں؟ میں بھابھی....مجھے معاف کیجئے گا، میں آپ سے بے حد....بے حد محبت کرتا ہوں، میں آپ کو اس حالت میں...نہیں دیکھ سکتا....بالکل نہیں....

جی..؟ وہ کانپ گئی۔

جی...! اس نے حتمی انداز میں کہا۔

اس کی سیاہ روشن اور چمکیلی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے، بھابھی...! میری کوئی نوکری نہیں لگی تھی، میں کہیں نہیں جاتا....مگر....مگر.... میں ہار مان گیا....ٹوٹ گیا خود سے لڑتے لڑتے، میں یہاں سے چلا گیا تاکہ آپ کو بھول سکوں، مگر....مگر....لا حاصل....

تو آپ نے شادی نہیں کی...؟ نہ جانے کیوں یہ بے تکا سا سوال اس کے ہونٹوں پر آ گیا۔

کی تھی....اس نے سر ہلایا، مگر میں اس میں آپ کو تلاش کرتا رہا، اس سیاہ رات میری آغوش سے لپٹ جانے والے اس گداز بدن کا لمس.....وہ بالوں کی خوشبو.....وہ اس کے قریب آ گیا...نہ جانے کیوں ...آج اسے جاوید کے بدن سے ایک آنچ سی اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کا چہرہ سرخ تھا اور آنکھیں.....؟ وہ ہمیشہ کی طرح ان آنکھوں میں زیادہ دیر نہ دیکھ سکی اور گھبرا کر پلکیں جھکا لیں۔

پھر..؟؟

وہ نہ جانے کیوں اس کے آگے بھی سننا چاہتی تھی...جاننا چاہتی تھی

پھر....پھر وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی.....ہمیشہ کے لیے....میں نے خود کو بہت سمجھایا، منایا...ایک آپ کی کمی پوری کرنے کے لیے....نہ جانے کتنے لوگوں سے بھیک مانگی، کہاں کہاں بھٹکا....میں برباد ہوگیا بھابھی.... آوارہ ہوگیا...بدچلن...اس کی آنکھوں سے جذبات چھلک پڑے۔

بھابھی....! وہ اس کے بے حد قریب آ گیا...

مجھے اپنا لو....

مجھے زندگی دے دو....میں مر رہا ہوں۔

میں نے بہت کوشش کی کہ آپ کو بھول جاؤں مگر لا حاصل۔ میں ان بیس سالوں کے ایک پل میں بھی آپ کو فراموش نہ کر سکا، بھول نہ سکا....اور آج....آج نہ جانے کیوں...کیسے...میرے قدم ایک بار پھر، اس گھر کی دہلیز تک آ گئے....میں نے بھائی کے بارے میں کئی دفعہ سنا تھا، مگر آج اپنی آنکھوں سے دیکھا، بھائی بہت اچھے انسان تھے، اللہ نے ایسا کیوں کیا بھابھی؟ آپ کو سہاگن ہوتے ہوئے بیوہ بنا دیا، اب میں کیا کروں...؟

جس آگ کو میں نے سینے میں دفن کرنا چاہا تھا آج وہ بھڑک کر شعلہ بن چکی ہے اور میرے وجود کو خاکستر کیے دے رہی ہے....اس نے اپنی باہوں میں اس کو سمیٹ لیا۔

وہ نہ جانے کون سا کمزور لمحہ تھا، جب جاوید کے گرم ہونٹ اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں میں پیوست ہو گئے...

اچانک بہت تیز ہوا چلی اور کچن کی کھڑکی کے پٹ ایک زوردار آواز کے ساتھ چوپٹ کھلے اور فوراً ہی دھڑام سے بند ہو گئے۔

وہ چونک گئی، بیدار ہوگئی، ایک خواب تھا، ایک طلسم تھا، جس سے دفعتاً وہ باہر آ گئی، تیزی سے اس نے اپنے وجود کو سمیٹا، یا اللہ....یہ میں نے کیا کیا؟ اس نے کانپ کر سوچا

کیا...کیا...میں اتنی پست اور بے غیرت ہوگئی ہوں؟ کہ کوئی بھی ....؟ ایکس....وائی...زیڈ...؟؟ یعنی....یعنی...کوئی بھی...؟

استغفر اللہ، لعنت ہو مجھ پر، کچھ غصے اور کچھ احساس ندامت سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

اس نے زور سے جاوید کو پرے ہٹایا اور تیزی سے وحید کے کمرے کی جانب لپکی، کہ شوہر بہر حال عورت کی پناہ ہوتا ہے...خواہ وہ ایک جسد بے حس ہی کیوں نہ ہو....

□□□

Farhat Nadir Rizvi
E -246/1 UGF
Syed Azhar Raza Apartment
Abulfazal Enclave Part 2
Allama Shibli Nomani Road,
Gali 22, Shaheen Bagh
New Delhi-110025

ناہید طاہر

بھوک

زندگی بہت پُرسکون گزر رہی تھی۔ دکھ مخلص ساتھی تھے۔ انھیں مسکراتے ہوئے جھیلنا سمیر اور اس کے اہل خانہ کا شیوہ بن گیا تھا۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ امید کے دیئے روشن کرتے سوچ کے دائرے فکری ژولیدگی اور پریشان نظری سے یکسر پاک، مسرور تھے کہ آنے والا وقت اپنے دامن میں کچھ بہاریں اور آسودگی لے آئے گا۔ جس کے تئیں زندگی میں خوشگوار راحتیں اور خوشیاں آنے کے امکان روشن تھے جس سے وقت پر جھونپڑی کا کرایہ ادا کیا جاسکتا ۔۔۔ بیوی کا علاج ۔۔۔ بچوں کی پڑھائی ۔۔۔ اماں کی آنکھوں کا آپریشن سب کچھ ممکن ہوسکتا تھا ۔۔۔ خوش گمانی کے روشن چراغ اس لیے بھی جل اٹھے تھے کہ اس سال کام اور دھندہ، اچھا چل رہا تھا۔ ترقی اور کامیابی کے بہتر امکانات نظر آرہے تھے۔

لیکن وقت کب کس کروٹ بیٹھ جائے یہ کسی کو علم نہیں۔ انسان اپنی سوچ کے گھوڑے خواہ کتنا ہی دوڑا لے ۔۔۔ ہوتا وہی جو منظورِ الٰہی ہو۔

ایک بھونچال جس نے نہ صرف سمیر بلکہ تمام دنیا کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ جیسے کوئی قیامت آگئی ہو۔

ہر طرف افراتفری اور سراسیمگی کا عالم طاری تھا۔ چہار سو ایک ایسی بیماری اور اس کی ہولناک تباہی کی خبریں پھیل گئیں، جس کا نہ اب تک کوئی علاج ممکن ہوا تھا اور نا ہی اس سے بچنے کی تدبیر سامنے آئی!! یہ وہ بلا تھی جو جہاں جہاں اپنا قدم رکھتی وہاں بے پناہ تباہی و بربادی کے نشانات چھوڑ جاتی۔

سائنس دانوں اور ماہرینِ طب نے اسے "کورونا وائرس" کا نام دیا۔ یہ ایک ایسا جرثومہ تھا جسے اب تک کسی نے نہیں دیکھا تھا بس جو کچھ بھی کہا جاتا تھا وہ صرف ایک گمان اور قیاس آرائی تھی۔ دنیا میں اس قہر کا نازل ہونا رب العالمین کی جانب سے کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ انسان، موت کے اس ننگے رقص کے آگے بے بسی کا مجسمہ بنا متحیر رہ گیا۔ جدید ٹیکنالوجی اور سائنسی ترقی جو بے پناہ بلندیوں پر محوِ پرواز تھی اس وباء کو بڑی بے بسی سے دیکھتی رہ گئی۔ اسے قابو میں لانا کسی کے بس میں نہ تھا۔ سائنٹسٹ پاگلوں کی مانند متلاشی تھے کہ اس وباء سے دنیا کو نجات دلاسکیں۔ متاثرین کا علاج کرتے ہوئے کئی ڈاکٹرز اور نرسیں اپنی قیمتی جانوں کی قربانی دے چکے تھے ۔۔۔ بے شمار جانیں گئیں ۔۔۔ لیکن ان جرثوموں کی پیاس بجھ نہ سکی بلکہ اس پیاس میں شدت ہی آتی چلی گئی۔

انسانی وجود سے جانیں کسی خزاں رسیدہ پتوں کی طرح زندگی کی سرسبز شاخوں سے ٹوٹ کر بکھرتی چلی جارہی تھیں ۔۔ افسوس حیات کی کشتی ساحل سے کنارہ کشی اختیار کیے، موت کے طوفانی بھنور میں ڈوبتی ہی جارہی تھی۔

ہر طرف ماحول، سوگوار اور عالم پر دکھ و غم کی ہولناک تاریکیاں چھائیں ہوئی تھیں۔ اس مصیبت سے کوئی راہِ فرار نظر نہ آئی تو احتیاطی تدابیر کے طور پر ملک میں لاک ڈاؤن اور کرفیو نافذ کیا گیا۔

گویا موت کا ڈر وجود پر مسلط کرنے کی کوشش!! کیونکہ اس ڈر

سے غرباء بالکل انجان اپنی فکرِ معاش میں ڈوبے ہوئے تھے۔اس طرح لوگ اپنے ہی گھروں میں قید ہوکر رہ گئے۔ ہر خاص و عام بے یار و مددگار نظر آرہا تھا۔ ہر آنے والی سانس پر شک ہوتا کہ کہیں یہ بے وفا تو نہیں؟ مصیبت بن کر لہراتے یہ سیاہ بادل، سمیر کے آنگن میں کچھ اس طرح ٹوٹ کر برسے کہ وہ تنکوں کی مانند بکھرتا چلا گیا۔ دل و دماغ پر ایک وحشت اور خوف طاری تھا۔ جب وہ رات کی تنہائی میں بے بسی سے روتا تو اماں کرب میں ڈوبی بوجھل آواز میں سسکاری بھرتی۔

'انسانی وجود سے جانیں کسی خزاں رسیدہ پتوں کی طرح زندگی کی سر سبز شاخوں سے ٹوٹ کر بکھرتی چلی جارہی تھیں۔۔افسوس حیات کی کشتیاں ساحل سے کنارہ کشی اختیار کیے، موت کے طوفانی بھنور میں ڈوبتے ہی جارہی تھی۔'

"صبر میرے بچے۔۔۔موت سے ہمیں نہیں ڈرنا چاہیے۔"

جواب میں وہ جھنجھلاہٹ سے کہتا

"اماں! موت سے کیسا ڈر؟

"تُو تو کہتی ہے موت، اٹل اور برحق ہے!!! میرے لیے موت سے بڑی فکر اپنوں کی بھوک اور روٹی ہے!!

معصوموں کے پیٹ کی آگ کیسے بجھاؤں؟ یہ سوال مجھے پاگل بنا دیتا ہے۔" بھوک کے پیٹ سوئے ہوئے بچوں کو دیکھ کر وہ بڑی بے بسی سے اپنے بال نوچنے لگتا۔

"ہاں۔۔۔ پاپی پیٹ کی آگ، روٹی کا ایندھن مانگتی ہے!!" اماں لاچاری سے آنسو خشک کرنے لگتی۔ سمیر کی بیوی خاموش طبع واقع ہوئی تھی۔اس کا ایک ہی کام ہوتا بچوں کو تسلی بخش تھپکی دینا۔۔۔وہ معصوم بچوں کے چہروں کو نہایت دکھ سے دیکھتی رہتی۔۔۔۔جن کے گرد آمیز چہروں پر آنسوؤں کی دھاریں خشک ہوکر جم گئیں ہوتی۔ وہ کرب آمیز لہجے میں بڑبڑاتی۔"بھوک! کرونا سے گھناؤنی اور بے رحم وباء ہے!!"

بے چارے غریبوں کو کام چاہیے تھا تاکہ مزدوری سے چار پیسے حاصل ہوں اور وہ اپنوں کے پیٹ کی آگ بجھا سکیں!!! لوگ اس بھوک سے تڑپتے ہوئے مرنے پر مجبور تھے۔ بے شمار جھونپڑیوں میں فاقہ کشی چل رہی تھی۔۔۔کئی لوگ تو اپنے وطن لوٹ گیے۔ایک دن اماں بڑی امید لیے بیٹے سے کہنے لگی۔

"سمیر! ہم بھی اپنے گھر واپس چلتے ہیں۔۔۔۔ ہر کوئی اپنے گھر جارہا ہے!!" کرایہ ادا نہ کرنے کی صورت میں جھونپڑی کا مالک روز روز گالی گلوچ کررہا تھا جس سے اماں کی عزتِ نفس مجروح ہورہی تھی۔ کیونکہ ان کے اپنے گاؤں میں چھت کے نام پر ٹین کا ایک تنگ مربع کمرہ موجود تھا جسے وہ اپنا متاعِ حیات سمجھتی اور طمانیت محسوس کرتی۔اس کے علاوہ انھیں گاؤں کے لوگوں سے ایک خاص انسیت تھی۔۔۔گڑ کی جلیبیاں، بارشوں میں کاغذ کی کشتیاں، میلے کی وہ بہاریں۔۔۔تپتی دھوپ میں دوشیزاؤں کے چہرے پر لمبا سا گھونگھٹ اور سروں پر پانی کے مٹکے۔۔۔ ذہن کے پردے پر جھلملا اٹھتے تو وہ بے چین ہوجاتی۔۔۔۔سمیر کے مرحوم باپ کی یادیں بھی وہاں کی فضاؤں میں تحلیل تھیں۔گاؤں سے شہر کی راہیں کسی ریشم کے لچھے کی طرح گنجلک ہوگئی تھیں۔۔۔اب تو گاؤں، لچھے کا وہ سرا ثابت ہوا تھا جو چاہ کر بھی ہاتھ نہیں آتا۔

"یہ ممکن نہیں اماں۔۔۔گاڑیاں، ٹرین سب بند ہیں۔۔۔لوگ پیدل جارہے ہیں۔"

"اچھا۔۔۔تو ہم بھی چلے جائیں گے۔"

"اماں اگر پیدل جائیں گے تو ایک ہفتہ لگے گا۔۔۔۔تیری یہ بیمار بہو۔۔۔چھوٹے پوتے کہاں سے چل پائیں گے؟ تُو بھی تو اتنی بوڑھی ہے۔۔۔راستے میں ہی دم توڑ دے گی۔" سمیر بات کو ٹالتا ہوا مزاح میں کہتا ہوا ہنس دیا تو اماں خاموش ہوگئی۔

فٹ پاتھ کے یہ گھر جو پلاسٹک سے بنے ہوئے تھے۔ان گھروں سے آنے والی روشنی بھی رات کے پہلے پہر ہی گل ہوجاتی اور ان کربناک راتوں میں بھوک سے محاذ آرائی شروع ہوتی تو اس کے اختتام کی کوئی امید بر نہیں آتی!!

بھوک! جو موت کے خوف سے بڑی مصیبت ثابت ہورہی تھی!!!

یوں لگتا تھا کہ زندگی، عذاب کا دریا بن گئی ہے!!! بھوک بھی کرونا وائرس کی طرح بنا چہرے کے جراثیم بنی، زندگیوں پر مسلط ہوگئی تھی جو گھر پر قید ہوں یا کہیں بھی مقید ہوں پیچھا چھوڑ نہیں رہی تھی!!

باہر نکلیں تو موت، نہ نکلیں تو موت!!! ہر طرف موت ہی موت بانہیں پھیلائے کھڑی نظر آرہی تھی۔لوگ جو حالات سے پریشان پیدل اپنے گاؤں کا رخ کیے ہوئے تھے انھیں راستے میں کئی مشکلات پیش آرہی تھیں۔۔۔کئی خاندان حادثات سے جاں بحق ہوگئے تھے تو کئی لوگ تھکن اور بھوک و پیاس کی شدت سے!!

"ھاں۔۔۔ پاپی پیٹ کی آگ ، روٹی کا ایندھن مانگتی ھے !! " اماں لاچاری سے آنسو خشک کرنے لگتی ۔سمیر کی بیوی خاموش طبع واقع ھوئی تھی۔اس کا ایک ھی کام ھوتا بچوں کو تسلی بخش تھپکی دینا۔۔وہ معصوم بچوں کے چھروں کو نہایت دکھ سے دیکھتی رھتی۔۔۔۔ جن کے گرد آمیز چھروں پر آنسوؤں کی دھاریں خشک ھوکر جم گئیں ھوتی۔ وہ کرب آمیز لھجے میں بڑبڑاتی۔" بھوک ! کرونا سے گھناؤنی اور بے رحم وباء ھے !!"

شہر کی شاہراہیں خاموش تھیں اور راہوں پر چھایا سکوت جیسے دل اور وجود کا سکون چھیننے میں کامیاب تھا۔۔۔وہیں ہائی وے کی شاہراہوں پر لاچار مسافروں کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا وہ بھی دل اور وجود کا سکون چھیننے میں کامیاب تھا۔

اپریل کی تپتی دھوپ، بھوک و پیاس سے نڈھال بدن۔۔۔بچے بھوک سے بلک اٹھتے ، ویسے بھی گرما کی طویل دوپہریں، جن سے وحشتیں بڑھ ہی جاتی ہیں۔سمیر کی بیوی نے روٹی پکائی۔بمشکل دو روٹی کا آٹا بچا ہوا تھا۔آٹے میں نمک کی آمیزش نے سالن کی کمی ، دور کرنے میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔ان دو روٹیوں کو سب نے مل بانٹ کر کھایا۔۔۔اماں نے جتنی دعائیں یاد تھیں سب پڑھ کر روٹی پر دم کردیں۔تاکہ روٹی میں برکت ہو اور سب کا پیٹ بھر جائے۔

جب فاقوں کی نوبت آنے لگی تو فٹ پاتھ کی ان نیلی، سیاہ پلاسٹک نما آشیانوں میں مقید انسان ایک دوسرے کی ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے اس لاک ڈاؤن کے سفر کو آسان بنانے کی کوشش میں لگ گئے۔قحط سالی موت کے سیاہ بادل بن گئے۔۔۔۔۔جو ٹوٹ کر برستے چلے گیے۔ ہر غریب پریشان تھا۔

لاک ڈاون کو 41 دن مکمل ہو چکے تھے لیکن دنیا سے نہ اس وبا کا خاتمہ ہوا تھا اور نا ہی کھانے کا کوئی انتظام ہو پایا۔

گزشتہ شام سمیر اپنی بستی کے وسط میں بہتے گٹر کے نالے میں بہت دیر تک مچھلیاں تلاش کرتا رہا لیکن افسوس سوائے ناکامی کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔۔

دو گھنٹوں کی مسافت طے کرنے کے بعد ایک لمبی قطار میں کھڑے انتظار کے بعد بڑی مشکل سے کھانے کے دو ڈبے میسر ہوتے کبھی صرف ایک ہی ملتا۔اتنے کھانے میں تین بچے، اماں اور سمیر اور اس کی بیوی کا گذارا ممکن نہ تھا۔۔۔بچے تو معصوم تھے وہ کسی کی کوئی پرواہ کیے بنا، لڑ جھگڑ کر تمام کھانا کھا جاتے۔سمیر کو اماں کی فکر لاحق ہوتی اور وہ بڑی مشکل سے چند لقمے اماں اور بیوی کے لیے بچا پاتا۔۔پھر خود پانی پی کر ماں کے سامنے پیٹ درد کا بہانا بنا کر اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ڈکار لینے لگتا تو اماں کی آنکھیں ممتا سے نم ہو جاتیں۔تین روتے بچوں کے ساتھ ضعیف ماں اور بیمار بیوی کو سنبھالنا سمیر کے لیے بہت مشکل ثابت ہو رہا تھا۔کام کی تلاش میں باہر نکلتا تو کام نہیں بلکہ پولیس کی مار کھانی پڑتی۔۔۔موت سے بچنے کے لیے لاک ڈاون کیا گیا تھا لیکن موت بھوک بن کر وباء سے پہلے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔

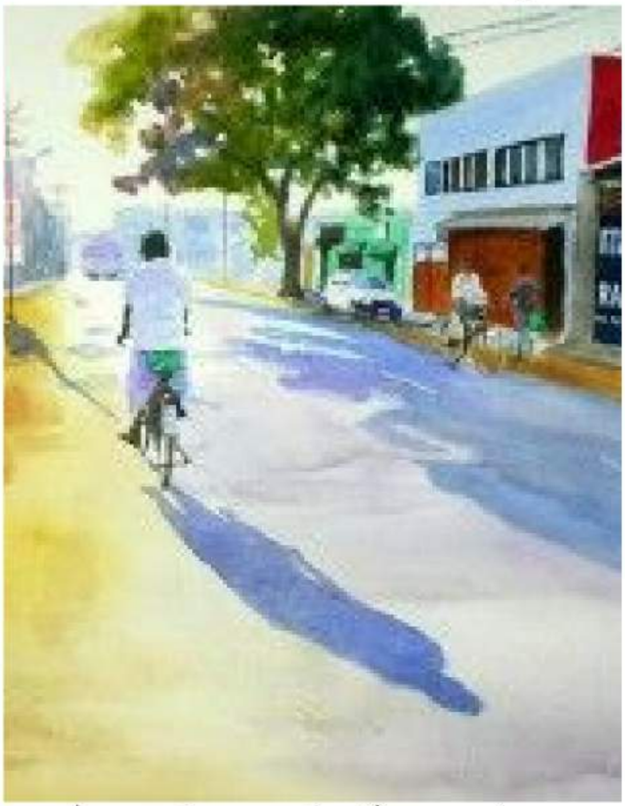

آج بھی اس نے دو گھنٹوں کی مسافت طے کر کے ایک لمبی قطار میں کھڑے انتظار کے بعد کھانا حاصل کیا تھا۔تینوں بچے ایک دوسرے کو نوچتے ہوئے کھانے پر جھپٹ پڑے تھے۔چھوٹا، بڑے کو ڈبہ نہیں دے رہا تھا۔بڑے نے غصہ اور بھوک سے بلبلا کر چھوٹے کے سر پر پتھر سے وار کیا۔۔۔خون کا فوارہ نکلنے لگا سمیر نے غصے سے بڑے کو تھپڑ رسید کیا تو وہ باہر دوڑ گیا، لیکن کچھ ہی فاصلے پر کمزوری کے باعث غش کھا کر گر گیا۔۔۔سمیر اسے کاندھوں پر اٹھا کر اندر لے آیا۔۔۔پانی کے چھینٹے مارنے پر

وہ ہوش میں آیا تو اس نے تینوں کو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلایا۔ اماں، بیوی کے لیے کچھ نہیں بچا تو وہ اپنے آنسوؤں کو روک نہیں پایا اور اونچی آواز میں روتا ہوا بال نوچنے لگا۔ حالات اس کی دسترس سے باہر تھے جن پر قابو پانا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ اپنا سر گھٹنوں رکھے سوچتا رہا۔۔۔۔ سوچ کے دھارے گہرے ہوتے گئے۔۔۔ کئی پل وہ ان میں تہہ بہ تہہ ڈوبتا ابھرتا رہا۔۔۔ آخر وہ کچھ فیصلہ کرتا ہوا اٹھا اور باہر نکل گیا۔ کچھ فاصلے پر پولیس ڈیوٹی انجام دیتی ہوئی نظر آرہی تھی۔۔۔۔ سمیر چھپتے چھپاتے آخر اس جگہ پہنچ ہی گیا۔۔۔۔ مسلسل ڈیڑھ گھنٹے بعد گھر لوٹا تو اس کا چہرہ عجب چمک لیے دمک رہا تھا۔

چاند بدلیوں کی آغوش میں منہ چھپا کر جیسے بادلوں کے چہرے پر سیاہی مل گیا، چہار سو اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سمیر نے سیاہ آسمان پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی اور ہاتھوں میں تھمے پلاسٹک کے ڈبے کو زمین پر رکھ دیا۔۔۔۔ دور چوراہے کے قریب الیکٹرک پول پر روشن بلب نے اس کے اندر ایک تازگی اور امنگ پیدا کی۔ سرکار کی جانب سے اتنی سہولتیں فراہم تھیں کے محلے اور چوراہے پر ٹمٹماتے بلبوں سے کچھ روشنی ضرور حاصل ہوتی اور یہ احساس دلانے کی کوشش کرتی کہ روزِ محشر، ابھی باقی ہے۔

اماں نے دروازے کے پاس ہی تلسی اور ایک کیاری میں نرگس کے پھولوں کا پودا لگا رکھا تھا۔۔۔ جس میں وہ ہر روز پانی ڈالتیں۔۔۔ کئی ہفتوں بعد ایک پھول کھلا تھا۔۔۔ جس کی بہت بھینی سی خوشبو تھی اور یہ خوشبو تلسی کے پودے کی خوشبو میں معدوم ہوتی محسوس ہوئی۔ افسوس یہ تازہ خوشبو بھی، اس کے منتشر دماغ پر کوئی سحر پیدا نہ کر سکی۔۔۔ چہار سو عجب سی ہولناکی چھائی ہوئی تھی۔۔۔ تاریک سناٹوں سے جھینگروں کی آوازیں اور کہیں قریب سے الو کے رونے کی آواز بھی ماحول پر وحشت طاری کر رہی تھی۔۔۔۔ اماں کی کھانسی بھی وقفے وقفے سے ان سناٹوں کا سکوت توڑنے میں سبقت لے جا رہی تھی۔

"اماں۔۔۔۔" اس نے جھونپڑی میں داخل ہو کر آواز دی۔

"آ گیا بیٹا۔۔۔۔" اماں نے امید بھری نظروں سے بیٹے کے ہاتھ میں تھمے ہوئے ڈبے کی طرف دیکھا۔

کئی دنوں بعد چولہا سلگایا گیا تھا۔۔۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں بچوں کے چہرے بے پناہ خوشی سے دمکتے ہوئے دکھائی دیئے۔۔۔ سمیر نے بیوی کو کام کرنے سے منع کیا اور خود ہی سوپ تیار کرنے لگا۔۔۔ اماں بھی بہت خوش تھیں بچے کھانے کے انتظار میں جوش سے کھلکھلا رہے تھے۔ اماں کئی دنوں بعد ہانڈی سے اٹھتی ہوئی بھاپ دیکھ کر خوشی سے گویا ہوئیں۔

"سمیر! دنیا میں اس سے بہتر کوئی نظارہ نہیں ہو سکتا!!!!" کچھ توقف کے بعد گویا ہوئی۔

"مجھے مسلمانوں کے وہ خلیفہ یاد آرہے ہیں جو اپنی خلافت میں بھیس بدل کر گشت لگایا کرتے تھے۔۔۔ یہ جاننے کے لیے کہ رعایا کا کیا حال ہے؟ وہ کن حالات سے گزر رہی ہے۔۔؟" ایک لمحے کو رک کر وہ مسکرائی اور دوبارہ کہنے لگی۔

"بیٹا! مجھے ایک پل کے لیے ایسا محسوس ہوا کہ ہم ماضی کے اس خوشگوار دور میں پہنچ گئے ہیں!! جہاں بچوں کو خوش کرنے کے لیے ایک ماں نے خالی ہانڈی کو چولہے پر چڑھا رکھا تھا۔"

"اماں! عمر فاروق ایک عظیم خلیفہ تھے۔۔۔" سمیر نے ہانڈی میں چمچہ چلاتے ہوئے کہا

"سمیر! ہانڈی سے اٹھتی ہوئی خوشبو میرے گمان کو شکست دینے میں کامیاب رہی ہے کہ اس ہانڈی میں صرف پانی نہیں بلکہ رب العالمین کی بخشی گئی کوئی نعمت بھی موجود ہے!!!" یہ سن کر سمیر کے چہرے پر کربناک مسکراہٹ پھیل گئی۔ اماں کاش اس دور میں بھی لوگوں کے اندر حضرت عمر فاروق جیسا جذبہ موجود ہوتا تو آج عوام وباء سے پہلے بھوک مری کے قہر سے نہیں مر رہی ہوتی۔۔۔۔ اس کی آواز میں بے پناہ آنسو اور آہیں پوشیدہ تھیں۔ اس نے لالٹین کی بتی بالکل کم کر دی۔۔۔ ٹمٹماتی روشنی میں ہانڈی کو چولہے سے نیچے کر لیا۔ اس نے بچوں کو سوپ دیا۔۔۔ کئی دنوں بعد گرما گرم کھانے کی نعمت حاصل ہوئی تھی۔ بچے اس سوپ کو پیتے ہی دبک کر سو گئے۔۔۔ اس نے بیوی کے لیے اور اماں کے لیے بھی سوپ نکالا۔۔ اماں کو کسی ذائقہ کی کوئی پرواہ نہ تھی بس وہ پیٹ کی آگ بجھانے میں پاگل نظر آئیں۔ بیوی نے بھی سیر ہو کر سوپ پیا۔ بہت تعریف کرتی رہی لیکن جب اس نے سوپ منہ میں لیا تو بے اختیار ابکائی آنے لگی۔۔۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھا دروازے کے باہر بھاگا اور زور سے قے کر دی۔ قریب پلاسٹک کے ڈبے سے مسلسل ٹرانے کی آوازیں اس کے دماغ کے خانوں کو نوچتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

Nahid Tahir
W/O Abu Tahir Ahmed
Project Manager, Saudi ceramic co.
P. O.Box No#40487
Second Industrial City
Alkharj Road
RIYADH-11499.K.S.A

ڈاکٹر شبنم عشائی

نظمیں

منزلوں کی تلاش میں
جتنی بھی مٹی کریدنی تھی
اس سے اپنے من کے
خالی پن کو بھرنا تھا
تم اس میں
کون سے پھول تلاش کرنے لگے
اس مٹی سے
میری کھوئی ہوئی محبتوں کی
خوشبو آتی ہے
پھول کہیں اُگے ہی نہیں
محبت کا کھیت ابھی
بارآور ہوا ہی نہیں......

کائنات
سناٹے کی چادر میں
اونگھ رہی ہے
زندگی کے بدن کی جھاگ
ساحلوں پہ سوکھ رہی ہے
کوئی لہر
اب سر نہیں پٹکتی
کوئی آواز
اب بدن سے
من تک نہیں آتی
من
خاموشی سے سن ہو رہا ہے
سناٹے کی سیلن پھیل رہی ہے
جانے کیا کچھ نازل ہونا ہے
قدرت کیا کچھ سوچ رہی ہے......

Shabnam Ashai
Ashai Manzil
Tapar Patan
Kashmir- 193121 (J & K)
Cell: 9797795748

ڈاکٹر شازیہ کمال

یہ کسی نے سوچا نہیں تھا

(کورونا وائرس کے زیر اثر)

مشغول تھی یہ دنیا کاروبارِ زیست میں
لگے ہوئے تھے ہم اور آپ اپنی اپنی فکر میں
رواں تھا دواں تھا کارواں جہان کا
نہیں تھا کوئی پہرا دن اور رات کا

کسے معلوم تھا اک نیا وائرس کورونا جنم لے گا
اس کی نہ دوا ہوگی نہ اس کا کوئی دھرم ہوگا
اس حقیر و بے جان شئے سے ہم دہل جائیں گے
ہمارے آداب کے اظہاریے بدل جائیں گے

کسے معلوم تھا دنیا کی بے ثباتی کا کریں گے ہم مشاہدہ
مسجد، مندر، گرجا گھر، گرودوارہ سے کریں گے ہم کنارہ
ہاتھ کا ملانا اور محفلوں میں بیٹھنا خواب ہو جائے گا
سڑکیں ویران ہو جائیں گی، گلیاں سنسان ہو جائیں گی

کسے معلوم تھا زندگی کی تمام راہیں مقفل ہو جائیں گی
کتنے ہی جسموں پر کورونا کفن چھوڑ جائے گا
ہم اور آپ بدل جائیں گے اطوار سے، اقدار سے
ہمارے سماج پر یہ دیرینہ اثر چھوڑ جائے گا

کسے معلوم تھا زندگی اک انداز سے تھم جائے گی
زندگی اور سانسوں کے رشتوں میں فاصلہ در آئے گا
سانسیں بہرحال چلتی رہیں گی مگر زندگی ٹھہر جائے گی
یہ کسی نے سوچا نہیں تھا زندگی یوں بدل جائے گی

Dr. Shazia Kamal
C/O:Haji Rahmatullah
Milli Masjid Lane, New Millat Colony
Sec-2, Station Road, Phulwari Sharif
Patna-801505 (Bihar)

ندا کاظمی

دل کے آنسو

کون سمجھے
کون جانے
ہر روز تیری راہ دیکھنا
اور ہر شب پھر تجھے نہ دیکھنا
وہ درد کے گرتے
آبشاروں کو
دکھوں کے ان
دیاروں کو
روح میں بستے
کون دیکھے
کون مانے

دل میں ٹپکے ان آنسوؤں کو......
تم بھولی ہوئی ان راہوں میں
پیاسی سی ان باہوں میں
گر لوٹ آو
تو اچھا ہے
ان گلیوں کو یوں ویران
دیکھ کر
میرے گھر کو یوں بیاباں
دیکھ کر
اس جان پے ہیں گزرے
کئی عرصے
کئی زمانے
دل میں ٹپکے ان آنسوؤں کو......

Nida kazmi
Village :Niloosa qazipora
Tehsil:Boniyar, Post office:mohra(uri)
Dist:Baramulla-193122
U.T: Jammu and Kashmir

لذیذ پکوان

چکن کریمی پاستا

اجزا: پاستا آدھا پیکٹ، پالک ایک گٹھی، چکن بریسٹ دو عدد، ٹماٹر دو عدد، لہسن چار جوئے، پارسلے ایک چوتھائی گٹھی باریک کٹے ہوئے، فریش کریم آدھی پیالی، موزریلا چیز آدھا پیکٹ، کالی مرچ ایک چائے کا چمچ کٹی ہوئی، دارچینی آدھا چائے کا چمچ پسی ہوئی، آئل تین کھانے کے چمچ، نمک حسب ذائقہ

ترکیب: پہلے پاستا کو ابال کر نرم کرلیں۔ پھر پالک کو باریک کاٹ کر ابالیں۔ اب چکن بریسٹ کو سلائس کریں۔ اس کے بعد پین میں تین کھانے کے چمچ تیل گرم کرکے باریک کٹے لہسن کے جوئے براؤن کرلیں۔ پھر اس میں چکن سلائس شامل کرکے اتنا پکائیں کہ اس کا رنگ تبدیل ہو جائے اور وہ نرم ہو جائے۔ اب اس میں باریک کٹے ٹماٹر، پارسلے اور ابلا ہوا پاستا ڈال کر ہلکی آنچ پر دو سے تین منٹ تک مکس کریں۔ جب وہ اچھی طرح مکس ہو جائیں تو اس میں فریش کریم، موزریلا چیز، نمک، پسی دارچینی اور کالی مرچ شامل کرکے تین سے چار منٹ تک تیز آنچ پر اچھی طرح بھونیں۔ آخر میں ابلی پالک ڈالیں اور دو سے تین منٹ تک مکس کرکے سرو کریں۔

پنیر کے کباب

اجزا: پنیر ایک پیکٹ (پاؤ بھر)، ڈبل روٹی کے توس چھ عدد، کچا سفید زیرہ پسا ہوا ایک چائے کا چمچ، سفید زیرہ بھنا ہوا آدھا چائے کا چمچ (پسا ہوا)، لال مرچ پسی ہوئی ایک چائے کا چمچ، بادام دس عدد (باریک چھل لیں)، پیاز درمیانی سائز کی (آملیٹ کی پیاز کی طرح باریک کاٹ لیں)، ادرک ایک چھوٹا سا ٹکڑا، ہری مرچ چار عدد (باریک کاٹ لیں)، انڈا ایک عدد، ڈبل روٹی کا چورا ایک پیکٹ یا ایک پیالی، کوکنگ آئل ایک پیالی (تلنے کے لیے)

ترکیب: سب سے پہلے پنیر کو کدوکش کرلیں اور گرینڈر میں پیس لیں۔ پھر ڈبل روٹی کے توس کے چاروں کنارے کاٹ کر باریک کرلیں اور پنیر میں ملا دیں۔ ساتھ ہی سارے مصالحے اور کرمیز بھی ملا دیں اور

تقریباً بیس منٹ کے لیے رکھ دیں پھر ہاتھوں میں ذرا سی چکنائی لگا کر کوفتے جیسے کباب بنالیں۔ ایک کڑاہی میں کوکنگ آئل گرم کریں۔ ہلکی آنچ میں فرائی کرلیں۔ جب گولڈن براؤن ہوجائیں تو نکال لیں اور کسی پیپر پر رکھ دیں تاکہ چکنائی جذب ہوجائے۔ یہ ڈش چھ افراد کے لیے کافی ہے۔

اسٹرابیری پائی

ترکیب: پہلے آدھا کپ، بہت ٹھنڈے اَن سالٹڈ بٹر کو آدھا انچ کے ٹکڑوں میں کاٹیں۔ اب ایک باؤل میں ایک چوتھائی کپ میدہ اور ایک ڈیڑھ چائے کا چمچہ پسی چینی کو ملا کر ایک چھری کی مدد سے اَن سالٹنڈ بٹر کو کیوبز میں اچھی طرح ملائیں۔ پھر اس میں 3 سے 4 کھانے کے چمچے برف والا پانی ڈال کر گوندھ لیں۔ اب ڈو کو کلنگ میں لپیٹ کر چند منٹ کے لیے ایک طرف رکھ دیں۔ اس کے بعد ڈو کو رول کر کے پائی پلیٹ میں ڈالیں پھر کرسٹ پر گریس پروف پیپر اور بیکنگ بینز رکھ دیں اور 180

ڈگری سینٹی گریڈ پر 15 سے 20 منٹ کے لیے بیک کرلیں۔ جب پائی کرسٹ گولڈن ہوجائے تو اوون سے نکال کر ٹھنڈا ہونے دیں۔ پھر اس پر پگھلی ہوئی گرم چاکلیٹ کی تہہ لگا کر سیٹ ہونے کے لیے چھوڑ دیں۔ اب اس پر اسٹرابیری کے سلائس کی تہہ لگادیں۔ 1 کپ گرم پانی میں 1 پیکٹ اسٹرابیری جالی کرسٹلز کو گھولیں اور نیم گرم جیلی کو اسٹرابیری والی تہہ پر پھیلائیں۔ آخر میں پائی کو فریج میں رکھیں اور جیلی سیٹ ہونے تک چند گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ اسٹرابیری پائی پر پھینٹی ہوئی کریم کا پیڑا رکھ کر سرو کریں۔

اورنج فروسٹ

اجزا: دودھ دو کپ، پانی ایک کپ، چینی تین کھانے کے چمچ، برف ایک کپ، اورنج جوس (فروزن) چھ اونس۔

ترکیب: تمام اجزا برف سمیت بلینڈر میں ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں یہاں تک کہ برف اچھی طرح گھل جائے۔ بچوں کے خوب صورت

مگ یا گلاس میں نکال کر ان کو سرو کریں۔ یہ ایک صحت بخش بریک فاسٹ ڈرنک ہے جو صبح سویرے آپ کے بچے کو بھرپور توانائی فراہم کرے گی۔ اس ڈرنگ میں شامل اورنج جوس وٹامن سی اور دودھ وٹامن اے اور ڈی سے مالا مال ہوتے ہیں جو آپ کے بچے کی بہترین نشوونما کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔

چکن پلاؤ

اجزا: چکن آدھا کلو، دہی ایک پاؤ، پسی ہوئی سرخ مرچ ایک چائے کا چمچ، نمک ایک چائے کا چمچ، ادرک لہسن پاؤڈر یا پیسٹ ایک چائے کا چمچ، آئل آدھی پیالی، آلو 4 عدد درمیانہ سائز کے کاٹ کر بوائل کر کے گلالیں، چاول آدھا کلو آدھا گھنٹے بھیگے ہوئے اور 2 منٹ تک بوائل کیے ہوئے، ہرا دھنیا پودینہ تھوڑا سا باریک کٹا ہوا، ہری مرچیں 5 یا 6 عدد لمبائی میں 4 ٹکڑے کرلیں۔

ترکیب: چکن دھو کر اس میں دہی آئل اور باقی مصالحے اچھی طرح مکس کرلیں، ایک بڑی دیگچی میں پہلے چکن ڈال کر پھیلائیں اب اس میں آلو اور ہرا مصالحہ ڈال کر پھیلائیں اور پھر بوائل کیے ہوئے چاول کی تہہ لگائیں، چاول پر ذرا سا زردے کا رنگ چھڑک دیں، اب ڈھکن ڈال کر اس پر کوئی بھاری چیز رکھیں کہ بھاپ باہر نہ آئے اور چولہے پر توا رکھ کر دیگچی توے پر رکھ کر پکائیں، پہلے 5 منٹ آنچ تیز رکھیں پھر ہلکی کردیں مزید 5 منٹ پکانے کے بعد ہلکے ہاتھ سے چکن اور چاول کو مکس کریں اور پھر چاول کے مکمل گل جانے تک پکائیں چکن خود اپنے پانی میں گل جائے گا۔

(بحوالہ www.meriurdu.com)

حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی

سن یاس یا انقطاع الطمث

(Menopause or Climactrium)

طمثی زندگی کی اوسط مدت 45 سال اور انتہائی 50 سال ہے، لیکن بہت سی ایسی عورتیں بھی ریکارڈ میں آئی ہیں جن میں 50 سال کی عمر میں یا اس کے بعد بھی حیض جاری رہا۔ دراصل بلوغ کی طرح سن یاس کے صحیح وقت کی تعین بھی ایک مشکل امر ہے، کیونکہ بہت سی عورتوں میں بہت جلد حیض شروع ہوا اور پچپن سال کی عمر تک جاری رہا۔ بسا اوقات اس کے بعد بھی یہ سلسلہ برقرار رہتا ہے۔ بعض عورتوں میں 40 سال کی عمر سے پیشتر ہی منقطع ہو جاتا ہے۔ اس تقدیم وتاخیر کا سبب ماہرین موروثی قرار دیتے ہیں کیونکہ بعض نسل وقوم میں بہت پہلے حیض جاری ہو جاتا ہے اور بعض میں غیر معمولی تاخیر ہو جاتی ہے۔ لہٰذا منافعاتی نزف کے لیے کوئی مخصوص عمر نہیں بتائی جا سکتی۔ اسی طرح 55 سال کے بعد بھی 6 ماہ کے وقفہ سے نزف کی رپورٹ ملی ہے۔

بسا اوقات فعال حصہ میں مبیضین کو بذریعہ عملیہ دور کر دینے پر بھی مصنوعی انقطاع قدرتی پوزیشن میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح رحم برآری (Hysterectomy) سے بھی انقطاع الطمث کی علامات پیدا ہو جاتی ہیں، لیکن بسا اوقات بلا کسی جرحی مداخلت کے قبل از وقت انقطاع الطمث کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

انقطاع الطمث پر عورت کے تولیدی حصہ کا اختتام یقیناً ہو جاتا ہے، اسی لیے اسے تغیر سن سے منسوب کرتے ہیں، تاہم اسے لازماً پیری کا پیش خیمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بعض عورتوں میں سن یاس کے بعد بھی بلوغ اور جوانی کی شادابی سالہا سال تک برقرار رہتی ہے، ہاں اگر ذہنی اختلال رونما ہو جائے، صحت بہت زیادہ گر جائے تو پیری میں کوئی شبہ نہیں۔ بعض عورتوں میں اختتام تبویض کے بعد بھی صنفی زندگی سالوں برقرار رہتی ہے، تاہم تولیدی استطاعت ختم ہو جاتی ہے۔

فعل طمث درج ذیل کسی ایک طریقے پر منقطع ہو جاتا ہے:

(ا) بسا اوقات 50 سال تک طبعی حالت میں حیض آتا رہتا ہے اور اس کے بعد بلا کسی واضح تغیر کے یک بیک منقطع ہو جاتا ہے۔

(ب) بیشتر عورتوں میں حیض تدریجی طور پر موقوف ہوتا ہے۔ جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایام ماہواری کے وقفوں میں بے قاعدگی آتی جاتی ہے۔ یعنی وقفے طوالت اختیار کرتے جاتے ہیں اور مقدار نزف گھٹتا جاتا ہے اور انجام کار بالکل ہی معدوم ہو جاتا ہے۔

(ج) بے قاعدگی ایام شروع ہونے پر نزف بکثرت یا خطرناک مدت تک جاری رہتا ہے۔ بسا اوقات نزف اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ عورت کا نظام اس کا متحمل نہیں ہو پاتا۔ ایسی حالت میں شدت نزف (امراضیاتی انقطاع الطمث) خصوصی اور فوری توجہ کا طالب ہوتا ہے، کیونکہ اس عمر میں کثرت سے نزف دروں رحمی سرطان کا پیش خیمہ یا سبب ثابت ہو سکتا ہے۔

مندرجہ بالا طمثی تغیر کے ساتھ کبھی درج ذیل 3 قسم کے عمومی اختلالات بھی پائے جاتے ہیں۔

(ا) حرکی (ب) تحولی (ج) نفسی

حرکی کی ممتاز ترین علامت کے طور پر 'تورد' (Flushing) یا

'احساس حرارت' کے حملے ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا گرم لہروں کے سمندر سے جسم گزر رہا ہے۔ اس کے ساتھ اگر منہ، گردن اور جسم کے دیگر حصوں میں امتلا ہو جائے تو اس کے زوال پر پسینہ نکل آتا ہے۔ یہ توردات سریع الزوال ہوتے ہیں، لیکن بعض مریضوں میں تا دیر یعنی تقریباً نصف گھنٹہ تک قائم رہتے ہیں۔ بسا اوقات دن میں متعدد باران کے حملے ہوتے ہیں، علاوہ بریں عصبی درد، جوارح میں جھنک یا سُن (خدر) کا احساس شدید طور پر پایا جاتا ہے۔ یاس و حرماں کا احساس بڑھ جاتا ہے۔

جب 'تورد' بہت زیادہ ہوتا ہے تو نسائی صنفی ہارمون عورت کے بول میں بھی موجود ہوتا ہے، لیکن بعض عورتوں میں انقطاع الطمث کے بعد مندرجہ بالا شکایتوں سے کوئی تکلیف نہیں پہنچتی، بلکہ بڑھاپا بھی ایک پُر وقار انداز میں آتا ہے، قویٰ میں نمایاں انحطاط نہیں ہوتا اور جاذبیت آخر عمر تک برقرار رہتی ہے۔

سن یاس شروع ہونے والی عمر میں بیش تمدد (Hypertension) ظہور پذیر ہو سکتا ہے، لیکن ایسا نخامی یا مبیضی افعال میں کسی طرح کے تغیر کے بغیر ہوتا ہے۔ یہ صداع، عسر تنفس اور خفقان قلب کی علامتوں کا ذمہ دار ہو سکتا ہے۔

تغیر کے طور پر فربہی کی جانب ایک واضح رجحان پایا جاتا ہے۔ جس کے سبب مزمن تحجر مفاصل کی شکایت پائی جاتی ہے۔ کاربوہائیڈریٹ کے تحول میں تغیر واقع ہونے پر چربی جمع ہو جاتی ہے۔ پستان غیر معمولی کلانی اختیار کر لیتے ہیں۔ دیوار شکم میں چربی کی فراہمی سے اکثر شکمی سلعہ کا شبہ ہوتا ہے۔

بعض عورتوں میں مبیضی اثر کے فقدان کے سبب ثانوی صنفی یا مردانہ خواص (مسترجلیت) پیدا ہو جاتے ہیں اور نمایاں امارت کے طور پر اوپر کے لب اور ٹھڈی پر بالوں کی روئیدگی ہونے لگتی ہے۔ ایسی عورتوں کو انقطاع الطمث کے حرکی یا دیگر مصنوعی علامتوں سے شاذ و نادر ہی اذیت پہنچتی ہے۔ فربہی کا علاج دروں افرازی معالجہ کے بجائے غذائی طور پر کرنا چاہیے۔

نفسیاتی تغیر کے طور پر ذہنی پسماندگی و درماندگی نمودار ہوتی ہے، چنانچہ زندگی بھر خوش رہنے والی عورتیں بھی چڑچڑی مزاج، ترش رو اور افسردہ خاطر ہو جاتی ہیں، بسا اوقات جسمانی توانائی، قوت حافظہ برداشت و تحمل کا بھی فقدان پایا جاتا ہے۔ سن یاس میں جنون پیدا ہونے کا بہت زیادہ احتمال رہتا ہے۔ گاہے عتاہت پیری (Senile asylums) کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ حالتیں آسودہ حال عورتوں میں زیادہ پیدا ہوتی ہیں۔

طبعی انقطاع الطمث کے زمانے میں عارض ہونے والے دروں افرازی عدم توازن میں رحم کی ماسکی عفونت (Focal Sepsis) اور دیگر عضوی تضررات سے اضافہ ہو جاتا ہے، ساتھ ہی نفسی اختلالات میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے لیکن رحم دور کر دینے پر جنون و مالیخولیا والی علامات از خود رفع ہو جاتی ہیں۔

بسا اوقات عقیم عورتوں میں انقطاع الطمث کا زمانہ قریب آنے پر رجایا حمل کاذب کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے اور مریضہ اپنے آپ کو دل سے حاملہ تصور کرنے لگتی ہے، کیونکہ یہ حالت حمل کی طبعی حالتوں سے قریب تر ہوتی ہے۔ معدم جس کے زیر اثر امتحان کرنے پر رحمی تغیرات کی عدم موجودگی کا بآسانی پتہ لگایا جا سکتا ہے۔

یاسیت کی تدابیر اور علاج: آغاز طمث کی طرح اختتام طمث کا دور بھی بڑا انقلاب آفریں دور ہوتا ہے، لہٰذا اس وقت بھی عورت کی عمومی صحت کا لحاظ رکھنا ناگزیر ہے۔ علامات کے علاج کی چنداں ضرورت نہیں، کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بیشتر علامات از خود رفع ہو جاتی ہیں، تاہم اگر کوئی علامت غیر معمولی شدت اختیار کر لے تو علاج میں تاخیر کرنی چاہیے۔ مسکنات، الکحل اور دافع درد ادویہ بار بار دینے سے عصبی المزاج عورتیں عادی ہو جاتی ہیں، لہٰذا انھیں شاذ حالات ہی میں استعمال کرایا جائے۔

اگر یاسی علائمیہ علاج کا طالب ہو تو معدل جذبات و دافع تشویش ادویہ میں سے لبریم (10 ملی گرام دن میں 3 بار) کا انتخاب مناسب رہے گا۔ شدید اصابات میں اکوانل (Equanil) بمقدار 4،0 گرام دے سکتے ہیں۔ شدید اصابات میں مینڈریکس (Mandrax) بھی مفید ہے۔ توردات، شیخوخی التہاب مہبل، شیخوخی درون رحمی التہاب وغیرہ میں اسٹل بائسٹرال کے استعمال سے اکثر حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوتے ہیں، لیکن اس کے کثرت استعمال سے شدت نزف کی شکایت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا احتیاط

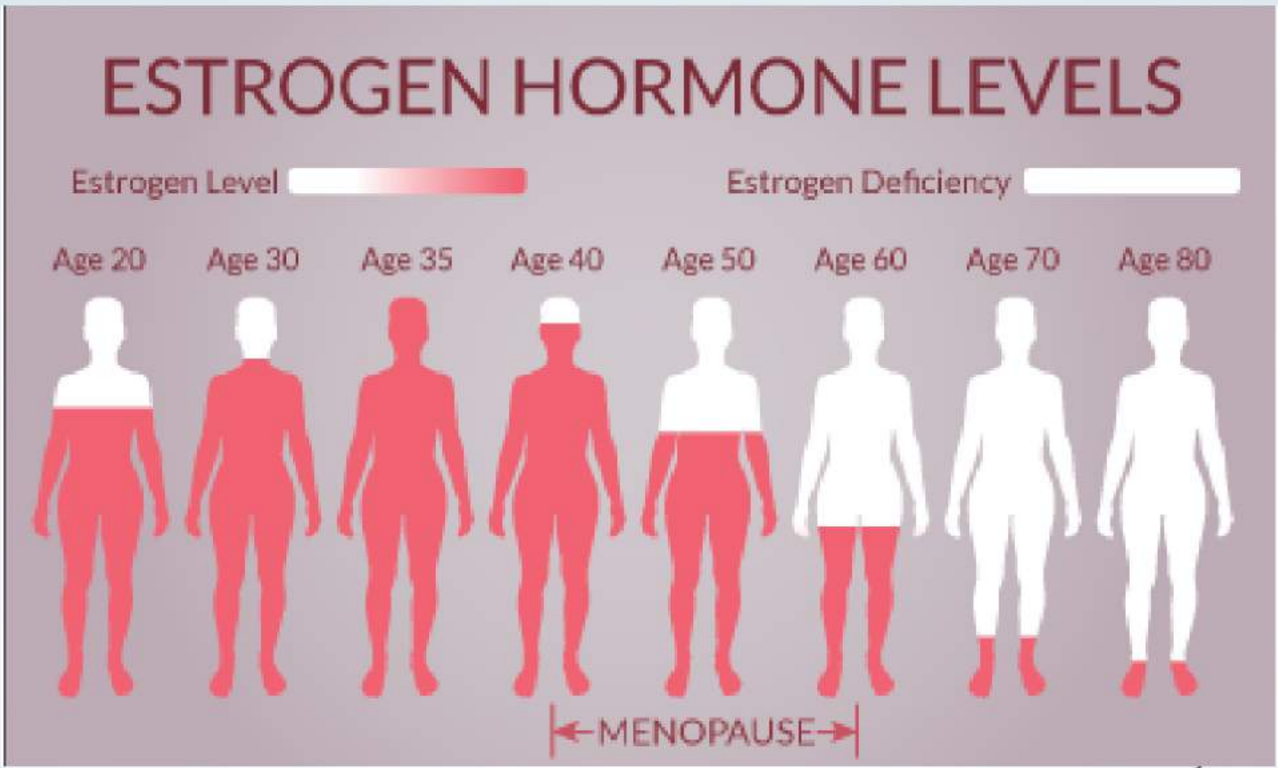

ضرور ملحوظ رکھنی چاہیے۔

یونانی علاج

مریضہ کو یقین دلانا چاہیے کے کبرسنی ایک فطری امر ہے، جس کا خیر مقدم بہر حال کرنا چاہیے کیونکہ اس سے فرار ممکن نہیں۔ مصروف وخوش و خرم زندگی گزارنے سے عموماً بہت سے یاسی علائے از خود معدوم ہو جاتے ہیں۔ شدید اصابات میں ہلکی ریاضت کرائیں۔ تلطیف و تقلیل غذا کی طرف توجہ دی جائے۔ زود ہضم پرندہ جانوروں کا گوشت مفید ہے، بالخصوص اگر اسے سرکہ کے ہمراہ دیا جائے۔

مربہ ہلیلہ کابلی، مربہ سونٹھ یا قدرے جوارش عنبر یا دواء المسک یا ان میں سے جو دستیاب ہو، استعمال کرائیں۔

خولنجان، پودینہ اور کرفس سے تلے ہوئے گوشت استعمال کرائیں۔ مخصوص (مخصوص طور سے تیار شدہ گوشت) جو لہسن مرچ سیاہ، سداب، کرفس اور اس طرح کی دیگر اشیا سے تیار کیا گیا ہو، استعمال کرائیں۔

اگر مزاج میں صفراویت کا غلبہ ہو تو شربت انار، پودینہ اور گلاب ملا کر نوش کرائیں اور ساتھ میں شربت سیب سادہ، میخوش، زلال تمر ہندی کو پودینہ میں جوش دے کر اس کے ساتھ پلائیں۔ اب رب انگور خام یا ریباس گلاب کے ساتھ دے سکتے ہیں۔

میخوش، آب بہی اور آب انار ہمراہ آب تمر ہندی مساوی الوزن لے کر اس میں پودینہ جوش دے کر چھان کر قدرے طباشیر ملا کر پلائیں۔

یاسی علاسمیہ میں سفوف ذیل بھی مفید ہے:

(ص) صندل سفید، کشنیز خشک، تخم خرفہ سیاہ، زہر مہرہ خطائی سائیدہ، طباشیر، گاؤزبان ہر ایک 6 گرام، مصری ہموزن کوٹ چھان کر سفوف تیار کریں۔

مقدار خوراک وترکیب استعمال: 12 گرام سفوف بوقت صبح عرق گاؤزباں 44 ملی لیٹر پھنکائیں۔ تقویت قلب اور تفریح کے لیے خمیرہ آبریشم حکیم ارشد والا یا شیرۂ عناب والا یا مفرح شیخ الرئیس بمقدار (5 گرام) لاجورد مفسول (512 ملی گرام) مروارید سائیدہ (24 ملی گرام) ملا کر چند یوم کھلائیں۔

پھلوں میں زبیب یعنی مویز کلاں، تخم کدو، پستہ اور انجیر خشک بادام کے ہمراہ کھلائیں۔

سبزیوں میں بادرنجبویہ، پودینہ اور خرفہ اور اسی قسم کی دیگر چیزیں مفید ہیں۔

یاسی علائمیہ میں بطور معدل جذبات بیخ اسرول خاص طور سے مفید ہے۔ دواء الشفاء، اکثیر شفاء معجون نجاح اور عرق ماء الجبن وغیرہ بھی مفید ہیں۔ یہ دوائیں تیار حالت میں مارکیٹ میں دستیاب ہیں۔

(امراض النساء، حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی، ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، پہلا ایڈیشن، 1978)

□□□

حسن کی نگہداشت

پروفیشنل میک اپ ٹپس

خوبصورت آنکھیں اچھے کردار کی عکاسی کرتی ہیں ہمارے چہرے پر لاکھ خوبصورتی اور رعنائی ہو لیکن اگر آنکھوں کو اچھے طریقے سے سجایا یا سنوارا نہ گیا ہو تو ساری دلکشی اور خوبصورتی بیکار ہے۔

آنکھوں کے میک اپ کے لیے چند اہم پروفیشنل ٹپس درج ذیل ہیں:

☆ آئی برو کو آنکھ کی ساخت کے مطابق بنوائیں زیادہ بہتر لمبی آئی برو ہے۔

☆ اگر آپ کے بالوں کا رنگ براؤن ہو تو آئی برو کو بھی ہلکا براؤن پنسل سے ٹچ دیں۔

☆ پلکوں پر مسکارا آنکھ کو اوپر کی طرف دیکھ کر لگائیں اور جیسے برش گول ہو مسکارا بھی گھما کر لگائیں۔

☆ مسکارا کا دوسرا کوٹ سوکھنے کے بعد لگائیں اور کناروں کو تھوڑی دیر کے لیے برش کے ساتھ دبا کر رکھیں۔

☆ لائنر کا استعمال آنکھوں کو دلفریب لک دیتا ہے اس لیے لائنر کو نفاست اور طریقے سے استعمال کریں۔

☆ آنکھ موٹی ہو تو لائنر کو آنکھ کے درمیانی پپوٹے سے موٹا کرلیں۔ اگر آنکھ چھوٹی یا اندر دھنسی ہوئی ہے تو لائنر ہلکا سا موٹا استعمال کریں۔

☆ آنکھ کو بڑا دکھانے کے لیے آنکھ کے اندر کاجل پنسل یا کاجل کا استعمال کریں۔

☆ میک اپ اتارتے وقت دھیان رکھیں کہ کسی بھی قسم کا ریموور آنکھ میں نہ جائے۔ ریموور استعمال کرنے سے بہتر ہے کہ نیم گرم پانی سے میک اپ اتار لیں اور روئی کی مدد سے یا پھر عرق گلاب سے میک اپ اتار لیں۔

لپ سٹک کی حفاظت

بیوٹی ٹپس میں لپ سٹک خواتین کی پسندیدہ ترین ہے جو ہونٹوں کو دلکش بنانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے اس لیے اگر تھوڑی سی سمجھداری سے کام لیا جائے تو لپ سٹک کی حفاظت کی جاسکتی ہے۔ اگر پسندیدہ لپ سٹک تھوڑی رہ جائے تو اس کو پھینکنے کی بجائے محفوظ کرلیں اس کے لیے تھوڑی سی تگ و دو کرنا ہوگی اور لپ سٹک محفوظ ہو جائے گی۔ ماچس کی تیلی کی مدد سے لپ سٹک کو نکالیں اور باقی لپ سٹک کو ڈھکن سمیت نہایت ہلکی آنچ پر

گرم کریں اور اس میں تھوڑی سی پیٹرولیم جیلی ڈال دیں تا کہ یہ چکنی ہو جائے۔ایک بار پھر اسے پگھلائیں اور آہستہ آہستہ تیلی سے ہلاتے جائیں تا کہ اچھی طرح مکس ہو جائے۔اگر کوئی پرانا کریم بلشر ہو تو وہ بھی اس میں ملا دیں۔بلشر ملاتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ اس کا رنگ لپ سٹک کے رنگ جیسا ہو اس طرح آپ کو اپنے پسندیدہ شیڈ کے مطابق لپ سٹک مل جائے گی۔ماہرین حسن وغذائیت کا کہنا ہے کہ لپ سٹک کو فرج میں رکھ کر بھی کافی مدت تک استعمال کے قابل بنایا جا سکتا ہے۔

آئی شیڈو کے لیے فائبر برش بہترین

اکثر خواتین صبح کے وقت آئی شیڈو لگانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتی ہیں کیونکہ کچھ گھنٹوں کے بعد ان کا یہ آئی شیڈو آنکھوں کے درمیان میں ایک گچھے کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور وہ لک بہت برا لگتا ہے۔ایک ماہر بیوٹیشن کے مطابق اپنی پلکوں کو آپ کینوس کی طرح سمجھیں جو کہ بالکل سادہ ہے اور اس سے کچھ پینٹ کرنے سے قبل رنگوں کا انتخاب کیا جاتا ہے یہی حال آئی شیڈو کا بھی ہوتا ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ دیے گئے ٹپس پر عمل کریں تا کہ آپ کی آئی شیڈو دیر تک قائم رہ سکیں۔آئی شیڈو کے لیے زیادہ بھاری آئی کریم استعمال نہ کریں۔دن کے وقت لائٹ کریم لگائیں جس میں سلی کون کا انتخاب کیا گیا ہو تا کہ پلکوں سے نکلنے والے قدرتی تیل کو یہ زیادہ سے زیادہ جذب کر سکے۔اپنی پلکوں پر فاؤنڈیشن یا کنسیلر کا استعمال نہ کریں۔ان کی غیر موجودگی میں آپ آئی شیڈو کے اثر کو اچھی طرح دیکھ سکیں۔کوئی آئی شیڈو بیس استعمال نہ کریں کیونکہ اس کے استعمال سے پلکیں بھاری ہو جاتی ہیں۔آج کل مارکیٹ میں فائبر فلیٹ برش کا بہت ٹرینڈ ہے اس کا استعمال کریں کیونکہ اس کا استعمال پلکوں کے لیے بہت مناسب رہتا ہے اور دیر تک قائم بھی اس لیے اس کا انتخاب آپ کے لیے بہترین ہے۔

چہرے سے داغ دور کرنے کا طریقہ

☆ پسی ہوئی سیپ دودھ میں گھول کر رات کو لگائیں۔صبح تازہ پانی سے منہ دھو لیں،داغ دور ہو جائیں گے۔

☆ ٹماٹر کا رس چہرے پر ملنے سے داغ ختم اور چہرے پر دلکشی بھی پیدا ہوتی ہے۔

☆ لیموں کا رس چہرے کے داغ کے لیے نہایت موزوں ہے۔

☆ مولی کے بیج پیس کر تھوڑے سے دہی میں ملا کر چہرے پر خوب ملیں چند دن ایسا کرنے سے داغ دور ہو جائیں گے۔

☆ کھیرے کو کدوکش کر کے کپڑے میں ڈال کر نچوڑیں اور رس نکال لیں۔اس میں ایک چمچہ دار چینی کا سفوف ملائیں اور روئی کے ساتھ چہرے پر لگائیں۔تقریباً بیس منٹ بعد منہ دھو لیں۔کچھ ہی دنوں میں داغ کا نشان تک باقی نہیں رہے گا۔

(بحوالہ www.meriurdu.com)

تاثرات: نگر نگر سے

''خواتین دنیا'' جون، 2020 نظر نواز ہوا۔ جس میں مختلف موضوعات پر آٹھ بہترین مضامین اور چار کہانیاں درج ہیں۔ مزید برآں گھر گرہستی، صحت اور حسن و نگہداشت جیسے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جس سے رسالے کی انفرادیت وخصوصیت عیاں ہو جاتی ہے۔ ''خواتین دنیا'' ایک معیاری اور ممتاز رسالہ ہے جو اردو ادب بالخصوص نسائی ادب کے لیے نمایاں کارنامے انجام دے رہا ہے۔ میرا تخلیق کردہ مضمون ''ترنم ریاض کی افسانہ نگاری کا مختصر جائزہ'' اس شمارے میں موجود ہے۔ ترنم ریاض نے خواتین کے احساسات و جذبات، ان کی محرومیوں، درد و کرب اور مردانہ بالادستی کے خلاف احتجاجی رویہ پیش کیا ہے۔ ''مشعل'' عنوان کے تحت مدیر کے خیالات خواتین کے سیاسی، سماجی اور تعلیمی لحاظ سے بے حد اہم ہیں۔ گو ''خواتین دنیا'' ذہنی، سماجی، معاشی اور تعلیمی سطح پر خواتین کی ذہن سازی کرتا ہے تاکہ وہ اپنے تصور اور نظریات کا انکشاف کر سکیں۔ دعا گو ہوں کہ ''خواتین دنیا'' کی نت نئی کوششیں اپنی آب و تاب اور چمک دمک کے ساتھ قائم و دائم رہے۔

نگہت امین، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مئی کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ اس شمارے کے مشمولات پر نظر پڑتے ہی میں نے رسالے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پچھلے شمارے کی طرح اس شمارے کے مضامین بھی توجہ طلب ہیں۔ رشید جہاں کے افسانوں میں نسوانی مسائل، جدید اردو افسانہ اور موضوعات، عہد حاضر میں کتب بینی کی صورت حال، کہکشاں انجم کا افسانوی سفر، عالم آرا بیگم کی شاعری، طلبا اور ہم نصابی سرگرمیاں، قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں ناسٹلجیا، راگھویندر راؤ جذب عالپوری اور اردو ترجمہ، اکیسویں صدی میں اردو ناول میں عصری مسائل اور اردو غزل کا مستقبل وغیرہ اس شمارے کے خاص مضامین ہیں۔ شاعرات کے منتخب اشعار بھی پسند آئے۔ کہانی 'پہلا قدم بہار کا' اچھی لگی۔ صبیحہ سنبل کی دونوں غزلیں بہت پسند آئیں۔ مثلاً یہ اشعار:

قدم قدم پہ لٹا ہے یوں اعتبارِ نظر
وفا بھی اب تو فریبِ وفا لگے ہے مجھے
کہاں کہاں کروں سجدے کسے کسے پوجوں
ہر ایک شخص زمیں کا خدا لگے ہے مجھے

صبیحہ سنبل کی دوسری غزل کے یہ اشعار بھی بہت معنی خیز اور توجہ طلب ہیں:

کئی برسوں سے جو قیدی مرے پندار میں ہے
اونچی پرواز کے پر تول رہا ہے مجھ میں

جو بھی اقدار مجھے اپنے بزرگوں سے ملیں
اس وراثت ہی کا بس مول رہا ہے مجھ میں

صحت کے تعلق سے جو مضمون درج ہے وہ بھی کافی معلوماتی ہے۔ پکوان بھی بہت ذائقے دار ہیں۔ حسن کو نکھارنے کے ٹوٹکے بھی مفید اور کارآمد ہیں۔ تاثرات کے تحت قارئین کی رائے بھی مثبت ہے۔ دعا گو ہوں کہ یہ رسالہ اسی طرح کامیابی سے ہم کنار ہوتا رہے۔

ماہ نور، الہ آباد، یوپی

اپریل2020 کا شمارہ موصول ہوا۔ سرورق بہت دیدہ زیب ہے۔ مضامین کا انتخاب بھی بہت عمدہ ہے۔ مینا نقوی کا انٹرویو پسند آیا۔ فکشن کے ساتھ ساتھ خواتین نے شاعری کے میدان میں بھی اپنی نمایاں پہچان قائم کی ہے۔ اس لحاظ سے مینا نقوی کی شاعری قارئین کے لیے کسی تحفہ سے کم نہیں ۔ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آکر قارئین سے داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں۔ سائبان، جاگتی آنکھیں، آئینہ وغیرہ ان کے شعری مجموعے ہیں جو ان کی شخصیت کو نمایاں کرنے میں معاون ہیں۔ مثلاً یہ شعر:

انتظار کے موسم ختم کیوں نہیں ہوتے
زندگی چراغوں کی لمحہ لمحہ مرتی ہے

شائستہ آفرین کا مضمون بھی اچھا لگا۔ سابق شماروں کی طرح اس شمارے میں بھی ایسے بہت سے مضامین درج ہیں جو خواتین کی شبیہ کو واضح کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

شاہین پروین، اورنگ آباد، مہاراشٹر

اپریل2020 کا شمارہ موصول ہوا۔ سرورق پر خاتون کی تصویر بہت عمدہ ہے۔ اداریہ میں مدیر اعلیٰ کے یہ خیالات قابل غور ہیں کہ:

’تصورات اور نظریات کسی عقیدے کے پابند نہیں ہوتے اگر ہندوستان کی تہذیب کا مطالعہ کیا جائے اور حالات کا جائزہ لیا جائے تو دیکھنے میں آتا ہے کہ تمام اختلاف کے باوجود یہاں کے لوگوں کے خیالات، جذبات ایک دوسرے سے بہت مماثلت رکھتے ہیں جو اس بات کے ضامن ہیں کہ ہند کے لوگوں میں ایک گہری وحدت موجود ہے۔ کبھی ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ انتشار کی وجہ سے ہندوستان کی وحدت کو ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن ہر دفعہ اتحاد کے ذریعے ہندوستان دوبارہ نئے سرے سے ہم آہنگ ہوا ہے اور ایک مشترکہ تہذیب وجود میں آئی۔‘ اداریہ میں ’سرودھرم سبھاؤ‘ کے نظریہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اتحاد پر زور دیا گیا۔ اردو شاعری میں قومی ہم آہنگی کی روایت اور اقبال میں بھی اسی نظریہ کو بنیاد بنا کر مضمون قلم بند کیا گیا ہے۔ جگر مراد آبادی کی شخصیت کے اہم نقوش، میں صبیحہ نسرین نے ان کی شاعری کا جائزہ پیش کیا ہے۔ تانیثیت اور اردو ناول، آفرین فاطمہ کے ذریعہ تحریر کیا گیا ہے جس میں تانیثیت اور ناول پر بحث کی گئی ہے۔ ’پیغام آفاقی کی افسانہ نگاری: موضوعات و اسالیب‘ راحلہ پروین کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے جس میں انھوں نے پیغام آفاقی کے افسانوں کا تجزیہ پیش کیا ہے’ مجروح سلطانپوری کی شاعری میں انسانی قدریں‘ ارم نعیم کا مضمون ہے جس میں انھوں نے مجروح کی شاعری کا تجزیہ فنکارانہ مہارت سے کیا ہے۔ ’عابد سہیل کے افسانوں میں فسادات کا ذکر‘ میں مضمون نگار نے فسادات پر مبنی ان کے اہم افسانوں کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ’اماں جی کا ابول‘، اور ’پرت‘ دونوں کہانیاں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ صحت کے تعلق سے کورونا وائرس پر اہم مضمون درج ہے جس میں مضمون نگار نے تفصیل سے اس وبا سے بچاؤ اور احتیاطی تدابیر پر زور دیا ہے۔ امید ہے کہ مستقبل میں بھی یہ رسالہ اپنی چمک دمک قائم رکھے گا۔

ریحانہ خاتون، بھوپال، مدھیہ پردیش

’خواتین دنیا‘ قومی اردو کونسل کا ایک عمدہ اور کارآمد رسالہ ہے جس میں عام طور پر خواتین سے متعلق کہانیاں، مضامین، انٹرویو، آرائش و زیبائش، خواتین کے منتخب اشعار، غزلیں نظمیں وغیرہ شائع کی جاتی ہیں۔ خواتین لذیذ پکوان کے تحت بھی دلچسپی کا اظہار کرتی ہیں۔ تاثرات کے تحت بھی خواتین اپنی فکر اور مثبت رویے کو ظاہر کرتی ہیں اور خواتین خبرنامہ کے ذریعے مختلف میدانوں میں ان کی نمایاں کارکردگی کو پیش کیا جاتا ہے۔

صالحہ بیگم، کولکاتہ، بنگال

اپریل 2020 کے تمام مضامین اعلیٰ اور معیاری ہیں۔ اس رسالے کی آرائش و زیبائش بھی کافی پر کشش ہے۔ سرورق بہت عمدہ اور خوبصورت ہے۔ مضامین کا انتخاب بھی لاجواب ہے۔ اس رسالے کا مقصد ہی خواتین میں پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا ہے تاکہ وہ بھی زندگی کے مختلف میدانوں میں اپنی کارکردگی کو نمایاں کرسکیں۔ میری نیک خواہشات اس رسالے کے لیے کہ یہ مستقبل میں اسی طرح ترقی کرتا رہے۔

زیبا خاتون، نئی دہلی

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اردو زبان وادب پر عربی کے اثرات

مصنف: ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی

مترجم: محمد طارق

صفحات: 507

قیمت: 225 روپے

جوامع الحکایات ولوامع الروایات (جلد اوّل)

مؤلف: سدید الدین محمد عوفی

مترجم: غلام سرور

صفحات: 275

قیمت: 155 روپے

اربابِ نثر اردو

مصنف: سید محمد

صفحات: 247

قیمت: 135 روپے

تذکرہ شعرائے رام پور

فارسی تصنیف: جارج فانتوم متخلص بہ صاحب وجرجیس

اردو ترجمہ وحواشی: مصباح احمد صدیقی

صفحات: 123، قیمت: 90 روپے

معاصر تنقیدی رویے

مصنف: ابوالکلام قاسمی

صفحات: 279

قیمت: 125 روپے

مرزا اسلامت علی دبیر (مونوگراف)

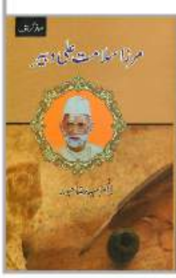

مصنف: سید رضا حیدر

صفحات: 134

قیمت: 85 روپے

خودنوشت سوانح عمری: شیخ علی حزیں لاہجیؒ

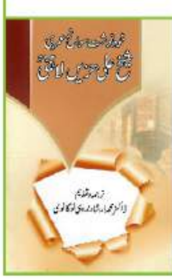

ترجمہ وتقدیم: ڈاکٹر محمد ارشاد ندوی نوگانوی

صفحات: 136

قیمت: 85 روپے

مشاہیر ادبیات مشرقی

مصنف: پروفیسر محسن عثمانی ندوی

صفحات: 292

قیمت: 145 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly July 2020, Vol. 4, Issue: 7 **RNI. No. DELURD/2017/74026**
National Council for Promotion of Urdu Language **ISSN 2581-4826**
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025